ادب اور زندگی کی مثبت اور آفاقی قدروں کا ترجمان

اثبات

کتابی سلسلہ — دوسرا دور

جنوری 2018 — شمارہ: 16



100/-

Esbaat Book-series

Season II
Issue No.16, January 2018

Publisher & Printer: Good Times Foundation — Editor: Ash'ar Najmi

B/003, Chandresh Terrace, Old Petrol Pumpl, Parshwa Nagar, Mira Road (East), Dist. Thane - 401107, Maharashtra, INDIA. E-Mail: esbaat@gmail.com
Contact Nos. Editor: 8169002417 (2pm to 5pm), Mgmt. 8652131995 / 9867798042



ادب اور زندگی کی مثبت اور آفاقی قدروں کا ترجمان

اثبات

کتابی سلسلہ — دوسرا دور

جنوری 2018 — شمارہ: 16

مدیر

اشعر نجمی

انتظامیہ

وقار قادری سکندر مرزا

قانونی مشیر

ضیغم رضوی

Good Times Foundation

(Regd. No. E/10056/Thane)

B/003, Chandresh Terrace, Near Old Petrol Pump,

Parshwa Nagar, Mira Road (East), Dist. Thane-401107 (INDIA)

فی شمارے کی قیمت

عام ڈاک (ہندوستان):	100 روپے
رجسٹرڈ/کوریئر:	200 روپے
لائبریری اور سرکاری ادارے:	200 روپے
بیرون ممالک:	10امریکی ڈالر

زرسالانہ (چار شماروں کے لیے)

عام ڈاک (ہندوستان):	400 روپے
رجسٹرڈ/کوریئر:	800 روپے
لائبریری اور سرکاری ادارے:	800 روپے
بیرون ممالک:	40امریکی ڈالر

تفصیلات برائے زرسالانہ

(۱) زرسالانہ منی آرڈر کی بجائے چیک/ڈرافٹ/بینک ٹرانسفر کے ذریعہ ہی ارسال کرنے کی کوشش کریں۔

(۲) چیک/ڈرافٹ صرف ''Good Times Foundation'' کے نام سے ہی جاری کریں۔

(۳) بینک ٹرانسفر کے لیے ضروری معلومات حسب ذیل ہیں:

Account Name: Good Times Foundation
Account No. 012100100001336
Bank Name: Vasai Vikas Sahakari Bank Ltd.
Branch: Mira Road
IFSC:VVSB0000012

رابطہ

تخلیقات اور زرسالانہ ارسال کرنے کے لیے صفحہ اول پر درج پتہ کا استعمال کریں۔

esbaat@gmail.com
Editor: 8169002417 (2pm to 5pm)
Management: 9867798042 / 8652131995

پرنٹر اور پبلشر سکندر مرزا نے ''Good Times Foundation'' کے لیے
چترا پرنٹنگ پریس، بھاینڈر (ایسٹ)، ضلع تھانے میں چھپوا کر
بی/۳، چندریش ٹیرس، پرانے پٹرول پمپ کے قریب، پرشوا نگر،
میرا روڈ (ایسٹ)، ضلع تھانے ۴۰۱۱۰۷ سے شائع کیا۔

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے	5	اشعر نجمی
سائنس اور شعری جمالیات	11	رچرڈ ڈاکنز
دانیال طریر کی چار غزلیں	28	دانیال طریر
دو مٹکے فارسی	30	جمیل احمد خاں
لال چیونٹیاں	35	صدیق عالم
مذہب اور سیاست: امتزاج، تصادم اور علیحدگی	53	ڈاکٹر مبارک علی
میرا خدا	66	علی شریعتی
نجیبہ عارف کی دو نظمیں	67	نجیبہ عارف
جنت میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں	68	نوال السعداوی
دانشور اور سماجی تبدیلی (چند ابتدائی باتیں)	74	ناصر عباس نیر
انڈہ	88	اینڈی ویئر
سُر، لفظ اور تال	92	یاسر اقبال
اکبر معصوم کی چار غزلیں	99	اکبر معصوم
اشاروں کی زبان	101	ایلین اور سیگال
چھ مراٹھی نظمیں	108	وقار قادری
ملحد کا اوورکوٹ	111	برٹولٹ بریخت
ساتواں سبق	118	زیف سید
جنسی شناخت کا ایک اور پہلو	136	سعید اختر ابراہیم
زاہد امروز کی نظمیں	145	زاہد امروز
ایلکس اپسٹائن کی کہانیاں	149	ایلکس اپسٹائن
ہاں، ہم سب حرامزادے ہیں	151	مکیش کمار

ایک درخواست

زندگی کے جتنے دروازے ہیں مجھ پہ بند ہیں
دیکھنا، حدِ نظر سے آگے بڑھ کر دیکھنا بھی جرم ہے
سوچنا، اپنے عقیدوں اور یقینوں سے نکل کر سوچنا بھی جرم ہے
آسماں در آسماں اسرار کی پرتیں ہٹا کر جھانکنا بھی جرم ہے
کیوں بھی کہنا جرم ہے، کیسے بھی کہنا جرم ہے
سانس لینے کی تو آزادی میسر ہے مگر
زندہ رہنے کے لیے انسان کو کچھ اور بھی درکار ہے
اور اس 'کچھ اور' بھی کا تذکرہ بھی جرم ہے
اے خداوندانِ ایوانِ عقاید
اے ہنرمندانِ آئین و سیاست
زندگی کے نام پر بس اک عنایت چاہیے
مجھ کو ان سارے جرائم کی اجازت چاہیے

احمد ندیم قاسمی

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اشعر نجمی

پہلے ایک کہانی سن لیجیے۔

شیر کو پنجرے میں ڈالنے کے بعد اس کے سامنے گھاس پھوس رکھی گئی تا کہ اسے کھا کر وہ اپنی بھوک مٹالے۔ ملازمین نے چڑیا گھر کے انچارج سے کہا کہ شیر گوشت خور ہے، بھلا گھاس پھوس کیسے کھا سکتا ہے؟ انچارج نے کہا کہ اسے یہاں اسی پر گذارہ کرنا ہوگا۔

اپنے سامنے گھاس دیکھ کر شیر کو سخت حیرت ہوئی۔ اس نے کہا کہ وہ گوشت خور ہے اور اپنا شکار خود کر کے کھاتا ہے۔ اگر اپنا شکار پکڑنے کی اجازت نہیں تو کم سے کم گوشت تو دیا جائے۔ بھلا، یہ گھاس یہاں کیوں کر ڈال دی گئی ہے؟ ملازمین نے اسے سمجھایا کہ یہاں اسے گھاس پر ہی گذارہ کرنا ہوگا۔ شیر نے یہ سن کر سخت بے عزتی محسوس کی اور گھاس کھانے سے انکار کر دیا۔

چند روز بھوکا رہنے کے بعد شیر نے اپنے شیر ہونے اور اس سے وابستہ فخر کے احساس کو الگ رکھ کر اپنے آپ کو سمجھانا شروع کیا: ''آخر چرندے گھاس کھا کر زندہ رہتے ہیں اور جب وہ انہیں پکڑنے کے لیے دوڑتا ہے تو وہ کس قدر تیز بھاگ لیتے ہیں۔ آخر یہ سب طاقت ان میں گھاس کھانے سے ہی تو آتی ہے۔''

شیر نے چڑیا گھر کے ملازمین کو گھاس لانے کے لیے کہا۔ ملازمین نے انچارج سے رجوع کیا۔ انچارج نے کہا کہ شیر سے کہو کہ گھاس ضرور مل سکتی ہے مگر اب اس کے لیے ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ شیر کو بلی کی طرح میاؤں کرنا ہوگی۔ شیر کو یہ شرط بتائی گئی۔ شیر نے کہا ''بھائی، میں جنگل کا بادشاہ ہوں اور میرے دھاڑنے سے پورا جنگل دہل جاتا ہے۔ بھلا میں کیوں کر بلی کی طرح میاؤں کر سکتا ہوں؟ ایسا کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔''

ایک آدھ دن مزید گذرا تو بھوک سے شیر تلملا اٹھا۔ اس نے خود کو سمجھانا شروع کیا کہ اس طرح ''ہٹ دھرمی'' سے وہ مر جائے گا۔ آخر میاؤں کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ اس سے وہ رہے گا تو شیر ہی ناں۔ آواز نکالنے سے کوئی بلی تھوڑا ہی بن جائے گا۔ اس نے ملازمین کو بلوایا اور انچارج کو میاؤں سنانے پر

رضامندی کا اظہار کیا۔ انچارج آیا تو شیر نے اس کے سامنے میاؤں کرنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ انچارج نے شیر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی میاؤں کو بہتر کرے اور جب اس کی میاؤں بلی کی میاؤں سے قریب تر ہو جائے گی تب اسے گھاس لینے کا حق دار سمجھا جائے گا۔ شیر نے بہتیرا احتجاج کیا مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔

بھوک سے برا حال ہو گیا تو شیر نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ اپنی میاؤں کو بہتر بنائے۔ اس نے 'ریاضت' شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ اس کی میاؤں میں صفائی آنے لگی۔ آخر ایک دن اس نے بڑے شفاف ڈھنگ سے میاؤں کر ہی ڈالی۔ انچارج نے اسے شاباشی دی اور اس کے سامنے گھاس ڈالنے کی اجازت دے دی۔ شیر نے گھاس کو منہ مارا۔ اسے چبایا، گھاس کے رس میں اسے بڑا لطف محسوس ہوا۔

سبط حسین کی اس کہانی کا تعلق نہ تو مجھ سے ہے اور نہ 'اثبات' سے، کیوں کہ مجھ تک پہنچتے پہنچتے اس کہانی کا شیر، شیر ہی رہتا ہے، کوشش کے باوجود بلی نہیں بن پاتا، حتیٰ کہ وہ گھاس چرنے کی بجائے بھوکے مرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اتفاق سے شیر آواگون پر یقین رکھتا تھا، اور دلچسپ بات یہ کہ اس کا 'پُنر جنم' بھی شیر کی 'جون' (قالب) میں ہوا۔

قارئین کا 'اثبات' کے دوسرے دور میں خیر مقدم ہے۔

تقریباً چار سال قبل 'اثبات' کے پہلے دور کا آخری شمارہ (نمبر ۱۴۔۱۵) شائع ہوا تھا، اس کے بعد تعطل کا شکار ہو گیا تھا۔ وجوہات کئی تھیں، جن میں سے شاید آپ کچھ جانتے ہوں اور کچھ کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن ان میں جو سب سے بڑی وجہ تھی، وہ یہ تھی کہ میں بور ہو گیا تھا۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں، پھر دہراتا ہوں کہ میرا پرچہ نکالنا زبان و ادب کی 'خدمت' وغیرہ جیسے نمائشی جذبے کے تحت نہ کبھی تھا اور نہ ہے۔ اس معاملے میں، میں نہایت ہی خود غرض واقع ہوا ہوں۔ 'اثبات' کی اشاعت میری علمی و ادبی مہم جوئی کی تسکین محض ہے۔ کچھ ادھ جلی غزلیں، کچھ کچی پکی نظمیں، کچھ لنگڑے لولے افسانے اور کچھ ہکلاتے ہوئے مضامین میرا ہدف کبھی نہیں رہے۔ آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ 'اثبات' کے اب تک کے شمارے کا زور 'مکالمے' پر رہا جو دو مختلف اور متضاد نکتہ ہائے نظر کے درمیان پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مکالمہ، جو افہام و تفہیم کی تخلیقی اور ناقابل پیش گوئی سفر کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ ترجمہ نگاری پر مبنی شمارہ ہو یا منٹو اور فیض شناسی پر، یا پھر فحش نگاری پر؛ میں نے کبھی چبے چبائے نوالے حلق کے نیچے اتارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مختلف موضوعات کے متعین کردہ جامد تصورات کو کھل کر چیلنج کیا اور مجھے خوشی ہے کہ آپ سب اختلاف رائے کے باوجود اس سفر میں میرے شریک رہے۔ پندرہ شمارے نکالنے کے بعد میرے پاس کچھ نیا کرنے کو نہیں بچا تھا، 'تنگنائے غزل' کا احساس شدید تر ہوتا چلا گیا۔ ان معصوم بھیڑوں کے ریوڑ کے خاندان کا رکن بننے کا خیال ہی میرے لیے سوہان روح سے کم نہ تھا جنھیں چرواہے 'صراط مستقیم' پر ہانکنا چاہتے ہیں۔ بلآخر کئی دیگر ضمنی وجوہات سے پرچہ 'طوفان نوح' کی زد میں آ گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا، موقع اچھا تھا۔ کشتیٔ نوح سے معذرت کی اور پرچے کو دھکا دے کر خود بھی نیچے چھلانگ لگا دی۔

طوفان ختم ہونے کے بعد کشتیٔ نوح تو کوہ جودی سے جا لگی لیکن زیر آب میں جس طوفان سے اب تک نبرد آزما رہا، اس کا بیان سر دست ممکن نہیں، البتہ اس کے کچھ نقوش آپ 'اثبات' کے اس دوسرے دور کے شماروں میں دیکھ پائیں گے۔

ممکن ہے کہ آپ کو زندگی اور ادب کے تعلق سے میری رائے بدلی ہوئی نظر آئے اور اغلب ہے کہ میرے پرانے تصورات و تحفظات میں آپ کو حیرت انگیز انقلاب نظر آئے۔ اس کی وجہ کچھ اور نہیں، صرف سیکھنے کا تعمیراتی عمل ہے۔ سیکھنے کا عمل محض معلومات کا اجتماع نہیں، جو کسی بھی فرد کے ارد گرد کتابوں پر میسر ہیں۔ ان گونگی، بہری اور بے جان معلومات میں زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کوئی شخص اپنی زندگی کے سابقہ تجربات اور حوالوں سے ان میں نئے معانی پیدا کرتا ہے۔ سیکھنے کے عمل کی شروعات سوالوں سے ہوتی ہے۔ جب کوئی صورت حال آپ کے فکری تناظر میں ارتعاش پیدا کرے تو اس کی علامت سوال کی صورت حال میں ظاہر ہوگی۔ ژاں پیاجے (Jean Piaget: 1980-1898) کے خیال میں سیکھنے کا تعمیراتی عمل چونکہ زندہ اور متحرک رشتوں پر ہو سکتا ہے، اس لیے اس میں تبدیلی کی گنجائش ہوتی ہے۔ تبدیلی ہوگی تو پرانے نظریات تبدیل ہوں گے۔ نئے نظریات پیدا ہوں گے تو نیا شعور پیدا ہوگا اور اس طرح ایک مسلسل، کبھی نہ رکنے والا عمل چلتا رہے گا۔ سیب درخت سے زمین پر گرتا ہے، یہ معلومات ہزاروں سالوں سے لوگوں کو معلوم تھی۔ آخر ایک شخص نے سوال کیا؛ سیب، درخت سے زمین پر ہی کیوں گرتا ہے؟ اب اس سوال نے گرنے کے اس عمل کے ساتھ سوال کرنے والے کا تعلق قائم کر دیا، کیوں کہ وہ اسے جاننا چاہتا ہے۔ نطشے نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جو سانپ جو اپنی کینچلی بدلنے سے قاصر ہو، وہ مر جاتا ہے۔ اسی طرح وہ دماغ جن کو اپنی رائے بدلنے سے روک دیا گیا ہو، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ رائے بدلنا آپ کے زندہ ہونے کی نشانی ہے، مردے اکڑ جایا کرتے ہیں۔

آپ میں سے بہتوں نے بچپن میں یہ خوب صورت نظم پڑھی ہوگی اور شاید اب تک یاد بھی ہوگی:

Humpty Dumpty sat on a wall
Humpty Dumpty had a great fall
All the king's horse, and all the king's men
Could'nt put Humpty together again

یہ نظم صدیوں زیر بحث رہی لیکن سوال ہیں کہ اب تک ختم نہیں ہوئے۔ مثلاً یہ ہمپٹی ڈمپٹی کون ہیں؟ انسان ہیں یا انڈا؟ اور یہ دیوار کیا ہے؛ کسی قلعہ کی دیوار ہے یا انا کی دیوار؟ یہ اپنے مخصوص اعتقادات و تحفظات کی دیوار ہے یا انکار و بغاوت کی؟ میرے نزدیک ہمپٹی ڈمپٹی اردو زبان ہے جو شاعری اور مذہب کی دیوار پر جا بیٹھی ہے اور کوشش کے باوجود اتر نہیں پا رہی ہے۔

میں نے کبھی کہا تھا کہ اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا بڑا ہاتھ ہے، میں اب بھی اس سے انکار نہیں کرتا لیکن فی الحال ہم وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی اس اردو زبان کے متعلق گفتگو نہیں کر رہے ہیں جس کی

جیب مذہبی خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'منہاج العربیۃ' اور 'تسہیل المصادر' رٹتے رٹتے مدرسوں کے طلبا کی اردو بحیثیت محرر اور بطور خاص بحیثیت مقرر کافی اچھی ہو جاتی ہے، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ طلبا اردو کو عربی اور فارسی کے توسط سے سیکھنے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ انھیں اردو زبان سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا، یہ محض 'اسلامیات' پڑھنے کے لیے اس زبان کو سیکھنے پر مجبور ہیں۔ اس کا ایک اور برا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں قصداً عربی اور فارسی کا تسلط قائم کیا جاتا رہا اور دوسری طرف ہندی الفاظ کا اخراج عمل میں آتا رہا۔ حتیٰ کہ یہ مدارس کے طلبا اور اساتذہ اردو بولتے ہوئے بھی مخرج کی ادائیگی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح انھیں عربی الفاظ کو ادا کرنے کی عادت ڈال دی گئی ہے؛ چنانچہ یہ اردو نہیں بولتے، کچھ اور بولتے ہیں، پتہ نہیں اس زبان کا نام کیا ہے؟

میں ان یونیورسٹیوں کی بھی بات نہیں کر رہا ہوں جہاں اردو پڑھنے والے بیشتر طلبا کا مقصد زبان و ادب میں ایم فل یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے انھی یونیورسٹیوں میں لیکچرر کے منصب پر فائز ہونا ہے۔ ایک بار فضیل جعفری نے ان یونیورسٹیوں کو جہالت مینوفیکچرنگ کرنے والی ایسی فیکٹریاں کہا تھا جہاں سے ہر سال جہلا کی ایک بڑی کھیپ نکلتی ہے اور انھی یونیورسٹیوں میں مزدوری پر معمور ہو جاتی ہے تا کہ نئی کھیپ تیار کی جا سکے۔ بات تلخ ہے لیکن یہی حقیقت ہے۔

معروف مورخ ڈاکٹر مبارک علی نے کتنی پیاری بات کہی ہے کہ کسی بھی زبان میں لکھا جانے والا لٹریچر اس زبان کے بولنے والے لوگوں کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی پختگی کے کس درجہ پر ہیں۔ اگر زبان میں نئے الفاظ و اصطلاحات کا اضافہ رہتا ہے تو اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سماج میں نئے خیالات، افکار اور نظریات کو روشناس کرایا جا رہا ہے۔ اگر زبان ایک جگہ ٹھہر جائے اور اس کے الفاظ اور اصطلاحات میں جمود آ جائے تو اس سے معاشرے کی پسماندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے جرمنی میں دانشوروں نے جرمن زبان کو صرف ادب کے بل بوتے پر نہیں، بلکہ فلسفہ، تاریخ، سائنس اور دوسرے علوم پر کتابیں لکھ کر اسے معیاری زبان بنایا۔ بیسویں صدی میں عربی زبان کو لبنان کے عیسائی دانشوروں نے نئے علوم سے مالا مال کیا۔ بلاشبہ اردو میں یورپ کی زبانوں سے سائنس، ٹیکنالوجی، سماجی علوم اور ادب کے تراجم ہوئے لیکن محض ترجموں کے ذریعہ کسی زبان کو اہم نہیں بنایا جا سکتا۔ تراجم زبان کو مقروض بنا دیتے ہیں، جب تک کسی زبان میں بنیادی تحقیقی کام نہ ہو، اس کے بولنے والوں کی ذہنی ترقی نہیں ہو سکتی۔

اردو زبان کی نشو و نما میں دہلی اور لکھنؤ کی اشرافیہ کا حصہ ہے، لہٰذا ابتدا میں زبان آرائی کو تخلیق کا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اردو زبان کا دوسرا اہم موضوع مذہب تھا بلکہ اب بھی ہے۔ لہٰذا شعر و شاعری، داستانوں اور مذہبی عقائد نے اردو زبان کو اپنا لیا اور اسے بولنے والوں کا یہی مخصوص ذہن بنا دیا۔

ذرا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور بتائیں کہ کیا آج بھی ہمارے یہاں سے شائع ہونے والے اردو اخباروں کو مسلمانوں کے مسائل کی نمائندگی کرنے سے فرصت ہے؟ کیا ان اردو اخباروں کے صفحات مذہبی ایام اور تہواروں میں خصوصی ضمیمے نہیں نکالتے؟ کیا دوسرے ہندوستانی تہواروں پر یہ اخبار یہی اہتمام

کرتے ہیں؟ کیا بیشتر مشاعروں کا آغاز تلاوت قرآن، حمد و نعت سے نہیں کیا جاتا؟ کیا ان مشاعروں میں شامل غیر مسلم شعرا ذہنی طور پر اردو کو مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھ بیٹھے ہیں کہ اپنے تماشائیوں کو خوش کرنے کے لیے قصداً مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی جذبات کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ بعض غیر مسلم شعرا تو مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے حمد اور نعت بھی پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور تماشائیوں میں شامل مدارس کے طلبا اور اساتذہ جھوم جھوم کر اچھل اچھل کر داد کے ڈونگرے برساتے ہیں؟ ماشا اللہ، سبحان اللہ، الحمد اللہ وغیرہ جیسی مخصوص اسلامی اصطلاحات اردو زبان کے اندر اس حد تک سرایت کر چکی ہیں کہ ایک روشن خیال ادیب بھی اس کی گرفت سے خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔ میں جب بیمار پڑا تو فیس بک پر بیشتر ادیبوں نے اللہ سے میری صحت عاجلہ و کاملہ کی دعائیں مانگیں، اور جب کوئی چل بستا ہے تو اکثر ہم اللہ سے اس کی مغفرت کی دعائیں مانگتے نظر آتے ہیں، ہم سے ایک ڈیڑھ جملہ بھی ان کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا چونکہ ہم ہمپٹی ڈمپٹی کی طرح دیوار پر چڑھ بیٹھے ہیں جس سے اترنے کی کوشش کرنا تک بھول چکے ہیں۔

سوال اٹھتا ہے کہ پھر اردو کا وہ سیکولر رویہ کہاں ہے جسے ثابت کرنے کے لیے آپ کلاسیکی ادب سے جدید ادب تک غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے اسمائے گرامی گنواتے پھرتے ہیں؟ پھر آپ سنگھ پریوار سے شاکی کیوں ہیں جو اردو کو مسلمانوں کی زبان ثابت کرنے پر عرصۂ دراز سے محنت کر رہی ہے؟ یہ کام تو خود آپ کر رہے ہیں، اور ڈنکے کی چوٹ پر کر رہے ہیں۔

اردو بولنے والوں کے اسی ذہنی رویے نے اسے دیگر سماجی علوم سے قطع تعلق کر دیا ہے۔ اردو کا شاعر یا ادیب فراٹے سے کلاسیکی ادب، ترقی پسند ادب، جدید اور مابعد جدیدیت پر بات کر لے گا، فلسفہ کو بھی کچھ لوگ ضمناً قبول کر لیں گے لیکن سائنس، ٹیکنالوجی، سیاسیات، عمرانیات، الٰہیات وغیرہ پر بات کرتے ہوئے ہکلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ژاں پال سارتر سے پاکستان کا ایک نامور ادیب ملاقات کرنے پہنچا۔ سارتر نے اسے آدھ گھنٹے کا وقت دیا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد سارتر نے حضرت ادیب سے دریافت کیا کہ جنوبی ایشیا میں موجودہ سیاسی کشمکش کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ادیب صاحب نے بڑے فخر سے منہ بناتے ہوئے کہا، ''جناب، میں شعر و ادب کا بندہ ہوں، مجھے سیاست سے کیا سروکار؟'' سارتر اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ ''جو شخص اپنے گرد و پیش سے اتنا لاتعلق ہو، اس کے ادیب ہونے پر بھی مجھے شک ہے۔''

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمارے اردو ادیبوں کا سماجی، تاریخی اور سیاسی شعور صفر ہے، بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ شعور صرف ادب کے حوالے سے ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوں اور ناولوں کو دیکھیے تو ان کے تاریخی شعور کا پتہ چلتا ہے، اور بھی کئی ہیں جن کی تخلیقات میں ان کے سماجی، تاریخی اور سیاسی شعور کی جھلک نمایاں ہوتی ہے، لیکن یہ صرف تخلیق ادب تک محدود رہتی ہے، ادیب کی شخصیت اس شعور کو انگیز نہیں کر پاتی۔ اس کی مثال بالکل مدرسہ کے ان طلبا کی سی ہے جو محض اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اردو زبان کا شعور رکھتے ہیں اور بقدر ضرورت رکھتے ہیں۔ میں یہاں 'ادیب کا منصب' یا 'ادب اور زندگی' یا جدلیاتی مادیت جیسے فرسودہ

موضوعات پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ فرانسیسی ادیب و دانشور احمق تھے جنھوں نے شہنشاہ لوئی چہار دہم کی بعض جنگوں کی مخالفت کی؟ نپولین کے تشدد کی مزاحمت کی؟ نطشے تو شاید آپ کی نظر میں گھامڑ ہی ہوگا، جس نے جرمنوں کی فرانسیسی انقلاب کی مخالفت کرنے پر برطانوی ارباب اقتدار کو لتاڑا؟ یہ صرف تاریخی کہانیاں نہیں ہیں؛ عصر حاضر میں ایڈورڈ سعید، مارٹن لوتھر کنگ، نوم چامسکی، طارق علی اور ارون دھتی رائے جیسے لوگوں نے اعزازات، انعامات، خطابات اور مراعات کو ٹھوکر مار کر اپنی ساری زندگی اپنے لکھے ہوئے کو جینے میں لگا دی، کیا انھوں نے اپنا وقت ضائع کیا؟ امریکی ادب اور سماجیات پر ہارپر لی (Harper Lee) کا کیا اثر ہے، اسی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ناول "To Kill a Mockingbird" کی اشاعت کے فوراً بعد ہی سارے امریکہ میں سیاہ فاموں کے حقوق کی جدوجہد زور پکڑ گئی اور گذشتہ پچاس سال میں انسانی حقوق کی کئی تحریکیں اس کے زیر اثر رہیں۔ ہمیں ایڈورڈ سعید کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ایک فلسطینی عیسائی تھا لیکن اس نے اپنی ساری زندگی ہر فلسطینی کے حق کے لیے قربان کردی۔ مثالیں اور بھی ہیں، لیکن یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اردو زبان اس منظرنامے سے خالی کیوں ہے؟ میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ صرف اردو والوں نے اپنے گرد یہ حصار کیوں کھینچ رکھا ہے، جب کہ ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں کے ادیب 'کھلے آسمانوں' میں سانسیں لیتے نظر آتے ہیں۔ وہ تخلیق ادب بھی کرتے ہیں اور آپ سے شاید بہتر ہی کرتے ہیں، لیکن دوسرے علوم بطور خاص معاشرت اور سیاست پر اظہار خیال کرنا بھی شجر ممنوعہ تصور نہیں کرتے۔ انگریزی، ہندی، مراٹھی اور دیگر زبانوں کے ادبی پرچوں میں بھی یہ کھلا پن آپ کو نظر آئے گا۔

لہٰذا، میں 'اثبات' کے دوسرے دور کے اس پہلے شمارے کے آغاز میں ہی بتادوں کہ آگے کا سفر اردو کو بحیثیت علمی زبان کے قبول کرنے والوں کے لیے مخصوص ہوگا۔ ہمارے لیے کوئی بھی موضوع شجر ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ جن لوگوں نے سننا چھوڑ دیا ہے، اب انھیں اس کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ جن لوگوں نے اختلاف رائے کو نعمت سمجھنا ترک کردیا ہے، انھیں پرانا سبق یاد دلانے کا وقت آچکا ہے۔ جو لوگ اپنے مخصوص 'جذبات کے مجروح' ہونے کی دہائی دے دے کر اب تک سوال اٹھانے پر لوگوں کی زبان قلم کرتے رہے ہیں، انھیں اپنا قبلہ درست کرلینا چاہیے۔ چونکہ جو نظریہ جس قطعیت کے ساتھ اپنے سچ ہونے کا دعویٰ پیش کرے گا، اسے اسی قدر تنقید کی سخت کسوٹی سے گذرنا بھی ہوگا۔ آزمائش سے یقینی طور پر وہی گھبرائے گا جسے اپنے کھوٹے ہونے کا یقین یا شک ہوگا۔ ہم ایک جمہوری معاشرے میں رہتے ہیں، جس میں ہر طرز فکر رکھنے والوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ جس طرح آپ کو اپنے نظریے کی تبلیغ کا حق حاصل ہے، اسی طرح ہمیں تنقید کا بھی ہے۔ اب آپ کو متبادل بیانیہ کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوجانا چاہیے۔

مجھے نہیں پتہ کہ یہ دوسرا دور کب تک جاری رہے گا اور کس شمارے کے بعد پرچہ بند ہوجائے گا۔ مجھے اس کی کوئی خاص فکر بھی نہیں، لیکن اتنا طے ہے کہ جب تک شیر زندہ رہے گا، خود شکار کرکے کھائے گا، گھاس نہیں کھائے گا۔

سائنس اور شعری جمالیات

رچرڈ ڈاکنز
ترجمہ: محمد ارشد رازی

رچرڈ ڈاکنز (Richard Dawkins) برطانیہ کے نامور ماہر ارتقائی حیاتیات اور مصنف ہیں۔ آپ ۱۹۹۵ سے ۲۰۰۸ تک آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر برائے عوامی تفہیم سائنسی علوم رہے ہیں۔ ۱۹۷۶ میں اپنی کتاب "The Selfish Gene" سے شہرت پانے والے رچرڈ ڈاکنز نے اپنی کتاب "The Extended Phenotype" (۱۹۸۲) میں ارتقائی حیاتیات سے وابستہ انقلابی نظریات پیش کیے۔ ۱۹۸۶ میں اپنی کتاب "The Blind Watchmaker" میں گھڑی ساز والے نظریے کی مخالفت میں دلائل دیے اور اسی کے تسلسل میں انھوں نے اپنی مشہور متنازعہ کتاب "The God Delusion" لکھی، جس میں انھوں نے کائنات کے ایک ماورائے طبعی خالق کے روایتی نظریے کے خلاف اپنا موقف پیش کیا۔ اس کتاب کا دنیا بھر میں ۳۰ سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے اور انگریزی متن کے دو ملین سے زائد نسخے فروخت ہوچکے ہیں۔ تاہم ڈارون کے نظریات کی شدید حمایت اور الوہی وجود کے بانگ دہل انکار پر مذہبی حلقوں کی طرف سے انھیں شدید تنقید کا سامنا رہا ہے۔ رجعت پسند حلقوں کی طرف سے انھیں 'ڈارون کا کتا' (Darwin's Rotweiler) اور اس جیسے القابات سے نوازا جاتا رہا ہے۔ زیر نظر مضمون رچرڈ ڈاکنز کی کتاب "Unweaving The Rainbow" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔

شناسائی کی بے حسی توڑنے کا کام شاعری میں بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ ان کی ندرت کلام اور پرواز تخیل یہ کام دکھاتی ہے لیکن شاعروں میں سے بیشتر سائنس کی پیش کاری کو نظرانداز کرتے چلے آرہے ہیں۔ ڈبلیو۔ ایچ آڈن اپنی نسل کے شاعروں میں سے ممتاز ترین تھا۔ اسے سائنس دانوں سے کچھ ہمدردی بھی تھی لیکن عملاً اس نے بھی انھیں سیاست دانوں کی صف میں کھڑا کردیا۔ غالباً آڈن بھی سائنس کے

شاعرانہ امکانات سے آگاہ نہیں ہوسکا تھا۔

ہمارا عہد عملاً سیاست دانوں کا نہیں، سائنس دانوں کا ہے۔ وہ اس کی صورت گری کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے شاعری ان کی توصیف و تحسین نہیں کرسکتی، کیوں کہ ان کے کارناموں کا تعلق اشخاص سے نہیں، چیزوں سے ہے جو کلام نہیں کرسکتیں۔ میں جب سائنس دانوں کی معیت میں ہوتا ہوں تو لگتا ہے کسی ڈیوک کے ڈرائنگ روم میں کوئی دم جھاڑا کرنے والا نکل آیا ہے۔ ("The Dyer's Hand", Poet and the City, 1963)

ستم ظریفی یہ ہے کہ مجھ سمیت بہت سے سائنس دان، شاعروں کی مجلس میں ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعروں اور سائنس دانوں کے اس طرز احساس کی وجہ سماجی اقدار ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا سماج معاشرے کے ان دو تکمیلی رنگوں کے نمائندوں کو کیا مقام دیتا ہے لیکن آڈن اس درجہ متفقین کیوں ہے کہ شاعری سائنس دانوں اور ان کے کارناموں کی تحسین نہیں کرسکتی؟ درست ہے کہ سائنس دان دنیا کو بدلنے میں سیاست دانوں اور حکمرانوں سے زیادہ مؤثر ہیں لیکن سائنس دان فقط یہی نہیں کرتے اور نہ ہی ان کی صلاحیتیں فقط یہاں تک محدود ہیں۔ اصل میں تو سائنس دان وسیع تر کائنات کے متعلق ہمارا طرز فکر بدلتے ہیں۔ وہ ہمیں اس گرم لمحے تک لے جاتے ہیں جب زماں کا آغاز ہوا تھا اور وہاں بھی جب ابدی ٹھنڈک اور اندھیرے کا راج ہوگا۔ کیا خاموش کائنات ایسا نہیں کہ قابل توجہ گردانی جائے؟ بالآخر شاعر فقط اشخاص پر ہی خیال آرائی کیوں کرے گا اور ان قوتوں پر کیوں نہیں جو اس فن کار کی بناوٹ کی ذمہ دار ہیں۔

ڈارون نے خاصی جرأت آزما کوشش کی لیکن اس کی دیگر صلاحیتیں شاعری سے کہیں زیادہ تھیں۔

''نباتات سے ڈھکے کسی ندی کے کنارے پر غور و فکر خاصا دلچسپ ہوسکتا ہے۔ طرح طرح کے درختوں اور جھاڑیوں پر رنگا رنگ پرندے بیٹھے ہیں۔ اردگرد کیڑے پتنگے اڑتے ہیں۔ نرم مٹی میں کیڑے کینچوے سرسراتے ہیں۔ تھوڑا سا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نہایت دقیق کاریگری کے متقاضی یہ اجسام اور نظام جو ایک دوسرے سے نہایت مختلف لیکن نہایت پیچیدہ طور پر ایک دوسرے پر منحصر ہیں، مخصوص قوانین کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں۔ فطرت کی جنگ، قحط اور موت جیسے عوامل کے نتیجے میں ان میں سے ارفع ترین یعنی اونچے درجے کے جانور وجود میں آتے ہیں۔ زندگی کے اس انداز نظر میں ایک شکوہ موجود ہے۔ حیات اپنی مختلف قوتوں سمیت کچھ یا، غالباً ایک جسم میں پھونک دی گئی تھی۔ کرۂ ارض مخصوص قوانین کے تحت دوری تبدیلیوں سے گذرتا رہا اور ابتدا میں وجود میں آنے والے نہایت سادہ نظام ان پیچیدہ جانداروں میں ڈھل گئے جو آج ہمیں کرۂ ارض پر نظر آتے ہیں۔'' (On the origin of species, 1859)

ولیم بلیک کی دلچسپیاں مذہبی اور متصوفانہ تھیں لیکن اس کا مندرجہ ذیل قطعہ ایک خاص مزاج کا مظہر ہے:

To see a world in grain of sand
And a heaven in a wild flower,

Hold infinity in the palm of your hand,
and eternity in an hour.

("Auguries of Innocence")

اس امر سے قطع نظر کہ اس کا اصل تناظر کیا ہے، ان سارے سطور کو سائنس کے حوالے سے بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایسی کوئی شے نہیں کہ اسے زمان و مکان کی تفہیم یا نباتات و حیوانات کے ارتقا کے عمل پر منطبق نہ کیا جا سکے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہیبت اور تحیر کا وہ سارا عمل جو بلیک کو سیرت اور تصوف کی طرف لے کر گیا، وہی کئی لوگوں کو سائنسی تحقیق کی طرف لے جاتا ہے۔ مظاہر کی تعبیر مختلف ہوسکتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صوفی اور سائنس دان کو ایک سے خیالات و جذبات تحریک دیتے ہیں۔ صوفی تحیر کی نرم دھوپ میں بیٹھنے پر قانع رہتا ہے اور خود پر ایسی سریت منکشف ہوتے دیکھتا ہے، جسے وہ ہمارے لیے قابل فہم نہیں سمجھتا۔ وہی تحیر سائنس دان کو بھی محسوس ہوتا ہے، لیکن اس کے ہاں طمانیت کی بجائے اضطراب کا سبب بنتا ہے۔ اسے بھی یہ اسرار خاصا عمیق لگتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ قابل فہم ہے اور اس پر کام ہو رہا ہے۔ بلیک کو بھی سائنس سے محبت نہیں بلکہ وہ اس سے خوف کھاتا ہے اور قدرے فاصلے پر رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم اسے شاعرانہ صلاحیتوں کا زیاں ہی کہہ سکتے ہیں۔ جدید چلن کے کچھ مبصر اصرار کرتے ہیں کہ اس طرز فکر کا پرچار سیاسی عزائم پر مبنی تھا۔ اگر یہ درست بھی ہے تو بھی یہ سطور صلاحیتوں کی زیاں ہی کہے جائیں گے، اس لیے کہ سیاست اور اس کا تمام تر کاروبار مقابلتاً نہایت عارضی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہان فکر کا کچھ علاقہ ایک مخصوص طرز فکر کے ساتھ وابستہ ہے۔ مناسب لفظ نہ ملنے کے باعث میں اس فکر کو شاعری کہوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنس دان اور شاعر کو ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں رہنا چاہیے۔ سائنس کی فتوحات شاعر کو زیادہ بہتر تحریک فراہم کرسکتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سائنس دان کو بھی اس علاقے سے بیگانگی اختیار نہیں کرنی چاہیے، جسے میں نے اوپر شاعری کی قلمرو قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ میں سائنس کے منظوم بیان کے حق میں دلائل نہیں دے رہا۔ اگرچہ اس طرح کا کام ہوتا رہا ہے، مثال کے طور پر چارلس ڈارون کے دادا ارزمس ڈارون نے سائنسی خیالات پر مبنی شاعری کی اور اس زمانے میں پڑھی بھی گئی، لیکن وہ بجائے خود سائنس میں کوئی اضافہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ اور سائنس دانوں کو بھی کارل سیگاں، پیٹر ایٹکن اور لورین ایزلے جیسی رواں طبع اور فطری صلاحیتوں کے بغیر اپنی دریافتوں کا ذکر شاعرانہ زبان میں بیان کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ ان کے لیے بہتر ہے کہ رواں، صحیح، سادہ اور سنجیدہ زبان کو ترجیح دیتے رہیں۔ ان کی تحریر کی خوبی یہی ہے کہ خیالات اپنا اظہار خود کریں، کیوں کہ سائنس کو شاعرانہ زبان میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ شاعری بجائے خود سائنس کے اندر موجود ہے۔

بعض اوقات شاعر مبہم بھی ہوسکتا ہے اور کبھی کبھار یہ عمل کئی طرح سے مفید ہوتا ہے۔ اسی لیے شاعر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی شاعری کے معانی کی وضاحت کرنے سے انکار کردے۔ ''مسٹر الیٹ مجھے فقط

اتنا بتادیں کہ کوئی اپنی زندگی کو کافی کے چمچوں سے کس طرح ماپ سکتا ہے؟'' یہ سوال کسی شاعر مثلاً الیٹ کے ساتھ گفتگو کا اچھا آغاز قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن ایک سائنس دان سے بالکل انھی معنوں کا سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ ''کوئی جین کن معنوں میں خودغرض ہوسکتا ہے''، یا یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ River out of Eden میں کیا بہتا چلا آتا ہے۔ میں پوچھنے پر بتانے کو تیار ہوں کہ کوہ کم احتمال (ImprobableMount) سے میری کیا مراد ہے اور اس پر کیوں کر دھیرے دھیرے چڑھا جاتا ہے۔ ہماری زبان کو معانی کی بار برداری کا اہل ہونا چاہیے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اگر معانی کسی ایک طریقہ سے بیان نہیں ہو پاتے تو کوئی دوسرا طریقہ دستیاب ہو جائے۔ ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ سائنس کی زبان نہ صرف درست ہو بلکہ اس میں سلاست اور روانی کی اضافی خوبیاں بھی موجود ہوں۔ تب ہی ممکن ہے کہ حقائق کو متاثر کیے بغیر سائنس کا بیان وہی تحیر پیدا کرے جو بلیک جیسے صوفیا کو متاثر کرتا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "Star trek" اور "Doctor Who" اپنے شائقین میں جس طرح کی سنسنی خیزی پیدا کرتے ہیں، اسی طرح کی سنسنی خیزی حقیقی سائنس کا بیان بھی پیدا کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نجوم کے ماہرین، حاضرات ارواح کے دعویدار اور اسی طرح کے دیگر شعبدہ باز انسان کے جذبۂ تحیر کو جس گھٹیا سطح پر استعمال کرتے ہیں، اسی کو سائنس کے بیان میں نہایت ارفع سطح پر بیان ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ نام نہاد سائنس دان ہمارے احساس تحیر کو ہائی جیک (اغوا) کر رہے ہیں اور یہ عمل بعدازاں زیرغور لایا جائے گا۔ کچھ اور چلن بھی سائنس کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کچھ نام نہاد ماہرین نے سائنس کو اسی طرح کا اسطورہ قرار دینے کا آغاز کیا ہے، جس طرح کا تمدن کے دیگر اسطوروں کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرز عمل کی وجوہات میں سے کچھ کا تعلق اجتماعی احساس جرم سے ہے۔ اس کی ایک مثال کینوک مین (Kennewick man) ہے۔ اس معاملے کے پس منظر میں مقامی امریکیوں کے ساتھ کیا گیا غیر منصفانہ سلوک ہے۔ کینوک میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جو ۱۹۹۵ میں ریاست واشنگٹن میں دریافت ہوا۔ تاریخ شماری کے کاربنی طریقہ سے پتہ چلا کہ یہ کوئی نو ہزار سال پرانا ہے۔ ماہرین بشریات نے اس کی جسمانی ساخت کا مطالعہ کیا اور حیران رہ گئے کہ یہ مقامی امریکہ باشندوں کی اکثریت سے قدرے مختلف ہے۔ ایک تجویز پیش کی گئی کہ مقامی باشندوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ امریکہ میں داخل ہوئے اور انھوں نے غالباً آبنائے بیرنگ کا راستہ استعمال کیا۔ ماہرین ابھی اس ڈھانچے کے ڈی این اے ٹیسٹ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ ایک قانونی اڑچن آپڑی۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ڈھانچہ قبضہ میں لے لیا تاکہ اسے مقامی امریکی قبائل کے حوالے کردیا جائے اور وہ اسے اپنے رسوم و رواج کے مطابق دفنا سکیں۔ ظاہر ہے کہ سائنسی برادری نے اس طرح کے عزائم پر شدید اعتراض کیا۔ اگر یہ ڈھانچہ واقعی کسی امریکی انڈین کا تھا، تو کیا ثبوت ہے کہ یہ اس وسیع وعریض علاقے میں نو ہزار سال پہلے مقیم کسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔

مقامی امریکیوں نے خاصے مصدق قانونی دلائل استعمال کیے اور ممکن تھا کہ ڈھانچہ ان کے حوالے کردیا جاتا لیکن اچانک معاملہ ایک انوکھا رخ اختیار کرگیا۔ نارسی دیوتاؤں تھور (Thor) اور اوڈن

(Odin) کے پجاریوں کے ایک گروپ (The asatru Folk assembly) نے الگ سے ایک قانونی دعویٰ کردیا کہ کینوک میں دراصل وائی کنگ تھا۔ اس نارڈی فرقے کے نقطہ نظر سے آگہی کے لیے "The Ruine Stone" کا گرما ۱۹۹۷ کا شمارہ پڑھا جاسکتا ہے۔ بالآخران لوگوں نے مقدمہ جیت لیا اور انھیں اجازت مل گئی کہ وہ ہڈیوں کے اسی ڈھانچے پر اپنی مذہبی رسوم ادا کرسکتے ہیں۔ اس فیصلے نے انڈین قبیلے Yakma کو پریشان کردیا کہ نارڈی رسوم ادا ہونے کی صورت میں کینوک مین کی روح اپنے جسم کو تلاش نہیں کرپائے گی۔ ڈی این اے تقابل کے طریقہ سے نارڈون اور انڈینوں کے درمیان یہ تنازعہ فیصلہ کن طور پر طے کیا جاسکتا ہے اور نارسوں کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں، لیکن انڈین قبائل اس سوال کا اٹھایا جانا ہی ناپسند کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ تخلیق کے وقت سے ہی اس علاقے میں آباد ہیں۔ املاٹلا قبیلے کے مذہبی رہنما کا کہنا ہے کہ زبانی قبائلی تاریخ کے مطابق اس کے اہل قبیلہ زماں کے آغاز سے یہیں آباد ہیں اور سائنس دانوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ کسی دوسرے براعظم سے یہاں پہنچے۔

ماہرین بشریات کے لیے بہترین راستہ غالباً یہی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے میدان عمل کو مذہب قرار دیں اور اعلان کردیں کہ ڈی این اے ان کا مقدس عمل ہے جس پر عمل کرنا ان پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے امریکہ کو دیکھتے ہوئے ماہرین بشریات کے لیے واحد عملی صورت یہی رہ جاتی ہے۔ آپ لاکھ کہتے رہیں کہ ڈی این اے اور آثار قدیمہ کے شواہد اسی بات کا اثبات کرتے ہیں لیکن آپ کی آواز نہیں سنی جائے گی لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ یہی بات میرے کلچر کا بنیادی حصہ ہے تو لوگ آپ کی طرف یوں دیکھیں گے، گویا آپ اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں امریکہ کی علمی کمیونٹی میں ایک نئی طرح کا رویہ پیدا ہوا ہے۔ یہ رویہ سائنس کے خلاف ادعا سازی کا چلن ہے۔ بعض اوقات اس رویے کو سائنس پر پس جدیدی تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں سے ممتاز ترین نام پال گراس کا ہے جس نے نارمن لیوٹ کے ساتھ مل کر ''Highersuperstition'' لکھی جو ۱۹۹۴ میں چھپی۔ کتاب میں علمی اداروں میں موجود بائیں بازو کے حلقے کی سائنس پر تنقیدی نظر کا جائزہ لیا گیا۔ امریکہ میں ماہر بشریات کاٹ مل (Cartmill) نے ۱۹۹۸ میں رسالہ "Discover" میں کتاب کے بنیادی مشمولات کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا:

''جو شخص کسی بھی چیز کے متعلق معروضی علم کا دعویٰ کرتا ہے، وہ دراصل باقی ہم سب کو مغلوب کرنے میں کوشاں ہے۔ معروضی حقائق کا کوئی وجود نہیں۔ ہمارے مفروضہ حقائق میں نظریات کی آمیزش ہے اور ایسے تمام نظریات میں سیاسی اور اخلاقی اصولوں کی کثافت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی لیبارٹری کے سفید کوٹ میں ملبوس کوئی شخص آپ کو بتاتا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے تو اپنی اصل میں وہ کسی نہ کسی سیاسی ایجنڈے کے تحت بول رہا ہوتا ہے۔ اس طرح کے لوگ خود ہماری اپنی صف میں بھی موجود ہیں جو باقی لوگوں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔''

کاٹ مل کا نظریہ یہ ہے کہ سائنس کے علم سے تہی دامن مذاہب اور انتہائی جدید بائیں بازو کے

مدرسانہ نظریات میں کوئی نہ کوئی رشتہ موجود ہے جس کی وضاحت نہیں ہوسکتی۔ ان کے اس اتحاد کی ایک عجیب و غریب مثال یہ ہے کہ دونوں نظریۂ ارتقا کے زبردست مخالف ہیں۔ مذہبی بنیاد پرستوں کی مخالفت تو نہایت کھلی ہوئی اور واضح ہے۔ جہاں تک بائیں بازو کا تعلق ہے تو ان کی مخالفت بھی اتنی سادہ نہیں۔ ارتقا کے متعلق ان کا معاندانہ رویہ سائنس کے ساتھ عمومی دشمنی، قبائلی تخلیقی اساطیر کی طرف جھکاؤ اور کچھ سیاسی ایجنڈوں سے مرکب ہے۔ سائنس کی مخالفت میں کمربستگی کی بنیاد پر ایک معاہدے میں شامل یہ دونوں انسانی عظمت کے پرچارک ہیں اور انسانوں اور حیوانوں پر ایک ساتھ ذکر پسند نہیں کرتے۔ ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت اہررش (Ehrenrecih) اور جینٹ میکنٹوش (Janet Mcintosh) کے ۱۹۹۷ کے ایک مضمون سے ہوتی ہے جو "The Nation" نامی رسالے میں چھپا۔ ثقافتی اضافیت اور ارفع توہم پرستی کے یہ مبلغ حقیقت کی تلاش کے سائنسی طریقے کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں۔ ان کے اس خیال کو دو چیزوں سے تقویت ملتی ہے۔ وہ قرار دیتے ہیں کہ مختلف ثقافتوں کی صداقت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دوسرے یہ کہ فلاسفۂ سائنس بھی کسی ایک اندازِ فکر پر متفق ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ کچھ حقیقی فلسفیانہ مشکلات واقعی موجود بھی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ کیا ہماری آج کی صداقت کوئی ایسا مفروضہ تو نہیں جسے تا حال جھٹلایا نہیں جا سکا؟ کوانٹم نظریے کی غیر متعین اور کم متیقن دنیا میں صداقت کا مقام کیا ہے؟ آیا کوئی حتمی صداقت موجود ہوسکتی ہے؟ لیکن دوسری طرف یہ حال ہے کہ جب انھیں فلسفیوں کو کسی بے بنیاد الزام کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا اسے اپنی شریکِ حیات پر غیر ازدواجی تعلقات کا شبہ ہوتا ہے تو اسے صداقت کی زبان استعمال کرنے میں کسی طرح کی مشکل پیش نہیں آتی۔ ہمیں کسی شے کی صداقت پر کیے گئے سوال پر بالعموم کوئی حیرت نہیں ہوتی لیکن اگر معاملہ ہماری نجی زندگی کا ہو تو ہم بالعموم کسی کا زیادہ گہرائی میں جانا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ خیالی کوانٹم تجربہ کرنے والے ''شروڈنگر کیٹ'' کے مردہ ہونے کا مطلب ہی نہ سمجھتے ہوں لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ میری پالتو بلی مر گئی ہے تو سب کو علم ہوتا ہے کہ میرے اس بیان کی اصل صداقت کیا ہے۔ لیکن بہت سے ایسے سائنسی حقائق بھی ہیں جن کے متعلق ہم فقط اتنا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارے روزمرہ تجربہ کے مطابق تو درست ہیں۔ اگر میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ ہم انسانوں اور چمپینزیوں کے آباواجداد مشترک تھے تو عین ممکن ہے کہ آپ میری بات کو مشکوک جانیں اور اس کے ابطال کے لیے شواہد اکٹھے کرنے لگیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کو اس میں ناکامی ہوگی لیکن میں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس بیان کے سچا یا جھوٹا ہونے کے مضمرات کیا کیا ہوسکتے ہیں؟ اسی طرح اگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آیا آپ فلاں جرم کے جائے وقوعہ پر موجود تھے یا نہیں تو یہ سوال ایک دوسرے سوال سے مختلف ہوگا کہ کیا کوانٹم کی کوئی پوزیشن ہوتی ہے یا نہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ صداقت کے متعلق فلسفیانہ مشکلات کا وجود ایک حقیقت ہے لیکن اس مشکل میں پڑے بغیر کافی دور تک جایا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات فلسفیانہ مسائل اٹھانے کی غرض دراصل غلطی کو چھپانا ہوتی ہے۔

سائنسی فہم و ادراک کو ایک اور خطرہ بھی لاحق ہے۔ یہ خطرہ عام آدمی کے لیے سائنس کی پیش کاری کے غلط طریقہ سے ہے۔ امریکہ میں اس طرح کا رجحان اس وقت شروع ہوا، جب سوویت یونین

کامیابی کے ساتھ خلابازی کے شعبہ میں امریکہ پر سبقت لے گیا۔ ہفتہ وار سائنس اور ماہوار سائنس کے نام پر بے شمار رسالے زوردار تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں کہ سائنس پُرلطف اور ذہنی تفریح جیسی کوئی چیز ہے۔ سائنس دانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عوام کو سائنس کی طرف متوجہ کرنے کے نام پر چھوٹے موٹے شعبدے دکھاتے رہیں۔ اس نعرہ کے دعویداروں کا خیال ہے کہ سائنس دانوں کو اپنی تمام تحقیق کا تعلق عام آدمی کی زندگی سے ثابت کرنا چاہیے۔ توقع کی جاتی ہے کہ زیرِ تحقیق کچھ بھی ہو۔ سائنس دان کو اس کا قریبی تعلق باتھ روم اور خواب گاہ کے ساتھ ملحق دیکھنا چاہیے۔ مختصراً یہ کہ عوامی لیکچروں میں استعمال ہونے والا سامان ایسا ہونا چاہیے کہ لیکچر کے خاتمے پر حاضرین اسے اپنے کام و دہن کی تواضع میں بھی استعمال کر سکیں۔ سائنس دانوں کو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ عام آدمی کو سائنس پر لیکچر ضرور دیں لیکن اس میں سائنس کے لفظ سے پرہیز کریں، مبادا حاضرین بدک جائیں۔

یہ درست ہے کہ اگر ہمارا مقصد لیکچروں کی حاضری کو بڑھانا ہے تو سائنس کی آسان پیش کاری معاون ثابت ہوسکتی ہے لیکن جب میں احتجاج کرتا ہوں کہ یوں سائنس کی اصل کھو جاتی ہے تو میری سرزنش کی جاتی ہے کہ کچھ بھی ہو ہمارا پہلا مقصد عام آدمی کے ساتھ تعلق کو قائم رکھنا ہے۔ ہم پر الزام لگتا ہے کہ ہم خود کو ایک مخصوص طبقے میں بدل دینے پر مصر ہیں۔ میں سنجیدگی سے سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے اصرار میں کوئی برائی نہیں۔ جب سائنس کی پیش کاری کے عمل میں بنیادی تصورات کی صحت داؤ پر لگا دی جاتی ہے تو اس کے سیاسی استعمالات بعید از فہم نہیں رہتے۔ میرا ایک صاحب سے واسطہ پڑا، جن کا خیال تھا کہ سائنس کی آسان پیش کاری عورتوں اور اقلیتوں کو سائنسی میدان میں آنے میں مدد دے گا۔

خاصے تجربے اور غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ میں پہنچا ہوں کہ سائنس کی آسان پیش کاری کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی مشکلات، مستقبل میں ارسال کرتے جائیں اور بالآخر یہ کسی لمحے پھٹ جائیں۔ حقیقی سائنس مشکل ہوتی ہے لیکن یہ اتنی ہی مشکل ہوتی ہے جتنا کلاسیکی ادب یا وائلن نوازی۔ ہمیں ان دونوں میں محنت اور جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کسی بچے کو سائنس یا کسی بھی ایسے مشق طلب کام کی طرف راغب کرنے کے لیے کہا جائے کہ یہ آسان ہے اور وہ آپ کی بات میں آ جائے تو حقیقت حال کھلنے پر کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس اعتبار سے فوج والے درست رویہ اپناتے ہیں۔ وہ اپنے اشتہاروں میں ہی بتا دیتے ہیں کہ فوج میں شمولیت کا مطلب پکنک نہیں۔ سائنس کی آسانی اور اس کے مزے کا سن کر اس کی طرف مائل ہونے والے غلط وجوہات کی بنیاد بنا کر اور غلط توقعات لے کر اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ادبیات کا مطالعہ بھی اس سہل انگاری کی خواہش کا شکار نظر آتا ہے۔ کم کوش طالب علموں کو بغیر کسی بنیاد کے معاشرتی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور وہ اپنا وقت مختلف طرح کی تقریباً غیر ضروری سرگرمیوں میں صرف کرنے کے بعد یونیورسٹیوں سے نکل جاتے ہیں۔ ادبیات کے سنجیدہ مطالعے کی طرح سائنس کا مطالعہ خاصا سنجیدہ چیلنج ہے اور یہ اتنا ہی مشکل بھی ہوسکتا ہے۔ سائنس کا مطالعہ یقیناً بے ثمر نہیں ٹھہرتا لیکن جس طرح فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کا مطالعہ فن کار بننے کی ضمانت نہیں دیتا، اسی طرح سائنس بھی ایسے کسی وعدے کی پابند نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اپنی اس ساری

تنقید میں کچھ زیادہ تلخ و تیز نہ ہو جاؤں لیکن بعض اوقات جب جھولتا ہوا پنڈولم کسی ایک طرف بہت زیادہ ہو جائے تو اسے توازن میں لانے کے لیے نسبتاً زیادہ قوت لگانا پڑتی ہے۔ درست ہے کہ سائنس مسرت ہے لیکن یہ مسرت اپنی اصل میں اکتاہٹ کی متضاد کیفیت ہے۔ اوسط درجے کے بہتر ذہن کو تمام عمر اکتاہٹ سے بچا سکتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ سائنس کی تعلیم اور شناسائی میں عملی تجربات بڑے معاون ہوتے ہیں اور ان کی مدد سے سیکھے گئے اصول دیرپا یادداشت میں ڈھلتے ہیں، مثلاً رائل سوسائٹی کی طرف سے مائیکل فاراڈے کے کرسمس لیکچروں نے کئی نسلوں کو سائنس میں آنے کے لیے تحریک فراہم کی۔ مجھے بھی اعزاز حاصل ہے کہ مجھے ان لیکچروں کے لیے بلایا گیا جو ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے۔ خود میں نے بھی یہ لیکچر دینے کا اعزاز حاصل کیا اور موقعہ پر تجربات کیے جنھیں ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا لیکن خیال رہنا چاہیے کہ فاراڈے تصورات کی وضاحت کی قیمت پر آسان کاری نہیں کرتا تھا۔ میں تو صرف سائنس کے ان نام نہاد مبلغوں کی بات کر رہا ہوں جو اس کے آسان ہونے کو باور کراتے کراتے اس میں شامل احساس تحیر کو ختم کر دیتے ہیں۔

برطانیہ میں سائنس کے مقبول عام ادب کی بڑی مانگ ہے۔ لندن کے ایک سالانہ بڑے اجتماع میں ایسی بہترین کتاب پر ہر سال انعام بھی دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک انعام بچوں کے لیے سائنس پر لکھی گئی کتاب کا ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں یہ انعام بچوں کے لیے کیڑے مکوڑوں پر لکھی گئی ایک کتاب پر دیا گیا۔ کتاب میں اس طرح کی زبان استعمال کی گئی ہے کہ سائنسی تحیر کی بجائے حشرات الارض سے کراہت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کتاب پڑھ کر کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے اندر موجود شاعرانہ لطافت اور انداز نظر کو تحریک دے سکتی ہے۔ تقریب انعامات کی صدارت ٹیلی ویژن کے ایک نامور میزبان نے کی اور اس تقریب میں غالب تعداد بچوں کی تھی۔ اس میزبان خاتون نے بھی کتاب کے انھی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی جو حشرات کے بدصورت ہونے کی عکاسی کرتے تھے۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ کس طرح کی مسرت کا سبب بن سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح تو ذہنی طور پر کوئی بھی صحت مند شخص حشرات پر توجہ دینے کو تیار ہی نہیں ہوگا۔

میں نے اوپر بار بار جو لفظ شاعر کے لیے استعمال کیا ہے، اس کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔ میں نے یہ لفظ ان تمام لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جو کسی نہ کسی طور پر فنون لطیفہ سے وابستہ ہیں۔ مائیکل اینجلو، باخ دونوں نے اپنے ادوار کو پیش کیا اور ان کا کام تادیر تعصید کا وظیفہ سرانجام دیتا رہے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کے علاوہ کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ مائیکل اینجلو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا ''دماغ ندی کے پانی پر بیٹھی لمبی ٹانگوں والی مکھی کی طرح چلتا تھا۔'' مجھے خیال آتا ہے کہ اگر مائیکل اینجلو کو پتہ ہوتا کہ ہمارا عصبی خلیہ اپنی بیرونی ساخت میں اس کی مکھی جیسا لگتا ہے تو وہ کیا کچھ نہیں بنا ڈالتا۔ اس کی ایک تصویر "Dies Irac" ہے، اس نے یہ خیال غالباً ڈائنا سوروں کے معدوم ہونے پر ورڈی کے شریحی نظریے سے لیا ہوگا کہ کوئی پینسٹھ ملین سال پہلے خاصی بڑی جسامت کی چٹان خلا کی وسعتوں سے آئی اور کوئی دس ہزار میل فی گھنٹہ پر سفر کرتی زمین سے ٹکرائی اور پورا کرۂ ارض تاریکی میں ڈوب گیا۔ انھی خطوں پر چلتے ہوئے آپ بیتھون کی سمفنی اور ملٹن کا رزمیہ "The Milky Way" پڑھ سکتے ہیں۔ اس بات کو شیکسپیئر تک بھی

لے جایا جا سکتا ہے لیکن میں قدرے کم تر پر اکتفا کروں گا۔

I can imagine, in some other world,
Primival-dumb, far back,
In that most awful stillness, that only gasped and hummed,
Humming-birds raced down the avenues,
Before anything had a soul,
While life was a heave of matter, half inanimate,
This little bit chipped off in brilliance
And went wizzing through the slow, vast, succulent stems,
I believe the pierced the slow vegetable veins with his long beak
Probably he was big.
As mosses, and little lizards, they say, were once big.
Probably he was jobbing, terrifying monster.
We look at him through the wrong end of the telescope of time,
Luckily for us.

(Unrhyming Poems, 1928)

ہمنگ برڈ کے متعلق ڈی ایچ لارنس کی یہ نظم مکمل طور پر غلط ہے، چنانچہ اسے کم از کم سطحی طور پر غیر سائنسی کہا جائے گا۔ لیکن یہ سطریں کم از کم اتنا ضرور بتاتی ہیں کہ کوئی شاعر ارضیاتی زماں سے کس طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر لارنس نے ارتقا اور جماعت بندی پر ابتدائی سطح کے کچھ لیکچر سنے ہوتے تو اس کی یہ نظم حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی اور اس کی دلچسپی اور فکر انگیزی میں بھی کوئی کمی نہ آتی۔ ایک کان کنی کے بیٹے لارنس نے قدرے زیادہ سائنسی آگہی حاصل کی ہوتی تو وہ کوئلوں کی آگ کو ایک اور ہی نظر سے دیکھتا۔ اسے پتہ چل جاتا کہ یہ آگ اور تمتماہٹ بھی دراصل سورج کی روشنی ہی ہے جو تین ملین صدیوں پہلے درختوں نے جذب کر لی اور پھر یہ درخت زمین کی عمیق گہرائیوں میں چلے گئے، لیکن اس سارے عمل میں لارنس کا ذہنی رویہ سائنسی نقطہ نظر کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا۔ لارنس کی غلط فہمی تھی سائنس اور سائنس دان شاعری کے خلاف ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے: ''سورج بھی سائنس کے ہاتھوں مر چکا ہے۔ سائنس نے اسے دھبے دار سطح والا گیسوں کا گولا قرار دے دیا ہے۔ سائنس اور تعقل کی دنیا خشک اور بنجر ہے، اس کا حامل ذہنی لطافت سے خالی تجریدی خیالات کی آماجگاہ ہے۔''

مجھے یہ بتاتے ہوئے قدرے ہچکچاہٹ ہو رہی ہے کہ میرا پسندیدہ شاعر ولیم بٹلر ییٹس ہے۔ آئرلینڈ کے اس پریشاں خیال شاعر نے اپنے آخری دنوں میں اپنا فکری نظام وضع کرنے کی ناکام کوشش کی اور مایوس

ہوکر دوبارہ اپنی نوعمری کے زمانے کے خیالات کی طرف مڑ گیا۔ مافوق الفطرت اور اساطیری موضوعات پر طبع آزمائی کرنے والے اس شاعر کی رہائش اس وقت کی سب سے بڑی فلکیاتی دوربین کی جائے تنصیب سے فقط دو میل دور تھی۔ راس کے تیسرے ارل ولیم پارسنز نے یہ ۷۲ انچ قطر کی انعکاسی دوربین ییٹس کی پیدائش سے پہلے بنائی تھی۔ ییٹس کو فقط ایک بار اس دوربین کی مدد سے کہکشاں کو دیکھنے کا موقع مل جاتا تو کیا کیا کچھ تخلیق نہ ہوجاتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ییٹس کی قبر کے کتبے پر کندہ اس کے الفاظ دراصل کسی بھی اچھے سائنس دان کے آخری الفاظ ہوسکتے ہیں۔ لیکن بلیک کی طرح ییٹس کو بھی سائنس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے نواح جات کی افیون قرار دے کر مسترد کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ قابل افسوس ہے۔ اسی طرح کا رویہ مجھے زیر نظر کتاب لکھنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔

یہ شکایت بھی کیٹس کو تھی کہ نیوٹن نے کہکشاں کی وضاحت کے عمل میں اس سے وابستہ جمالیات کو برباد کردیا ہے۔ دراصل اس کے ان الفاظ میں بہت سے لوگوں کا رویہ دیکھا جاسکتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ سائنس مسرت کے لیے سعی سے عاری خشک، ٹھنڈا اور بے کیف طرز کار ہے، یا یوں کہیے کہ عہد جوانی سے گذرتے نوجوان کے لیے سائنس میں کوئی دلکشی نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے کی ایک غرض اس طرح کے خیالات کی تردید کرنا ہے لیکن مجھے یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ اگر کیٹس اور ییٹس کی طرح کے شاعروں نے فطرت سے بھی تحریک لی ہوتی تو وہ نسبتاً بہتر شاعر ہوسکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کیٹس نے اپنی طب کی تعلیم کے باعث اپنی تپ دق کی تشخیص خود کرلی تھی اور مرنے سے کافی پہلے اس امر سے آگاہ ہوگیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ سائنس اس کے لیے بشارت دہندہ ثابت نہ ہوئی بلکہ بری خبر کا ذریعہ بن گئی۔ چنانچہ کچھ تعجب نہیں کہ اس نے کلاسیکی اسطوروں میں پناہ لی اور عملی زندگی سے کنارہ کش ہوکر ماورائے فطرت کرداروں پر مشتمل اپنے ایک الگ جہان میں بس گیا۔ کیا ان عظیم شاعروں کے متعلق بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے معاشرے کو اسی قوت سے متاثر کیا جس قوت سے تحریک دینے والے منبع نے انھیں کیا تھا۔

میرا دعویٰ ہے کہ تحیر کا جو جذبہ بلیک کو مسیحی تصوف، کیٹس کو آرکیڈیئس اسطورے اور ییٹس کو پریوں کے اسطورے میں لے گیا، وہی کسی بھی بڑے سائنس دانوں کے لیے قوت محرکہ ثابت ہوسکتا ہے۔ اس جذبہ کے تحت پیدا ہونے والے سائنسی خیالات شاعر کو دے دیے جائیں تو وہ عظیم تر شاعری پیدا کرسکتا ہے۔ اپنی بات کی دلیل کے طور پر قدرے کم تر درجہ کی شے یعنی سائنس فکشن کا حوالہ دوں گا۔ جولیئس برنے، ایچ جی ویلز، آئزک ایسی موف، آرتھر سی کلارک اور رے بریڈ بری نے سائنسی خیالات کا شوق پیدا کرنے کے لیے نثر میں شاعری کی ہے اور کئی جگہ سائنسی خیالات کا تعلق اسطوروں کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اگرچہ کلاسیکی ادب کے کچھ عالم سائنس فکشن کو کچھ ایسا وقیع خیال نہیں کرتے لیکن میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ میں ایسے کئی صف اول کے سائنس دانوں کو جانتا ہوں جنھیں سائنس کی طرف آنے کی تحریک سائنسی ادب سے ملی۔ سائنسی ادب نے ابتدائی عمر میں ہی ان کے احساس تحیر کو بیدار کیا تھا۔

ادب کی باقی اصناف کی طرح سائنس فکشن بھی گھٹیا اور بڑھیا ہوتا ہے۔ اگرچہ کچھ مصنفین نے اسے بعض مذموم مقاصد کے لیے بھی برتا۔ مثال کے طور پر ایل رون ہبرٹ کا ذکر کرنا نامناسب نہیں ہوگا جس نے ایک مذہب سائنٹالوجی کی بنیاد رکھی۔ آکسفورڈ کی لغات الاقوال میں اس کا ایک مقولہ درج ہے، ''اگر آپ واقعی لاکھوں کمانے کے خواہش مند ہیں تو تیز ترین طریقہ یہی ہے کہ اپنا ایک مذہب وضع کرلیں۔'' ہیون گیٹ نامی عقیدے سے وابستہ لوگوں میں سے کئی ایک نے شیکسپیئر اور کیٹس کا ایک صفحہ بھی نہ پڑھا ہو لیکن انھوں نے ''اسٹار ٹریک'' جیسے فکشن پڑھے اور پھر اس کے گرویدہ ہوگئے۔ ان کے اشاعتی مواد میں ناقص بنیادوں پر سیکھی گئی سائنس اور بدترین رومانوی شاعری کا ملاپ دیکھنے کو ملتا ہے۔

''ایکس فائلز'' نامی کلٹ (cult) کا بھی یہی حال ہے۔ اس کے دفاع میں کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ کلیتاً فکشن ہے، چنانچہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوسکتا۔ بظاہر یہ دلیل درست ہے لیکن کئی ایک پروگرام بڑے تواتر کے ساتھ دنیا کے متعلق یک رخا تاثر پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ''ایکس فائلز'' نامی یہ سیریز ٹی وی پر مدتوں چلتی رہی۔ ہر قسط میں نئی کہانی دکھائی جاتی ہے اور ایف بی آئی کے دو ایجنٹ کوئی نہ کوئی مسئلہ حل کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کرداروں میں سے ایک اسکلی (Scully) ہے جو منطقی استدلال اور سائنسی وضاحت پر یقین رکھتا ہے۔ دوسرا ایجنٹ ملڈر (Mulder) غیر سائنسی اور مافوق الفطرت دلائل دیتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ کچھ چیزوں کو ناقابل وضاحت قرار دے کر ناظرین پر اپنی برتری جتلانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بالعموم دکھایا جاتا ہے کہ اس کا جواب درست ہے۔ اس کی آخری آخری قسطوں میں تو ہم اسکلی کو اپنے سائنسی طرز کار سے دستبردار ہوتا دیکھتے ہیں۔

تو کیا خیال ہے کہ یہ سب بے ضرر فکشن ہیں؟ یقیناً نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ آپ خود سلسلہ وار کھیل کا ایک پروگرام ترتیب دیں اور ہر ہفتہ ایک نیا معمہ حل کرکے پولس والوں کو دکھائیں۔ ہر ہفتے دکھایا جائے کہ ایک کالا اور ایک گورا مشکوک ٹھہرائے گئے ہیں۔ سراغ رسانوں میں سے ایک کالے کا اور دوسرا گورے کا حمایتی ہے۔ ہماری فلم آگے بڑھتی ہے اور اس امر کے شواہد مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں کہ جرم کالے نے کیا ہے۔ اب بھی یہی کہا جائے گا کہ اس میں ایسی کوئی برائی نہیں اور یہ فکشن بے ضرر ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ ایک سطح پر فکشن بھی حقیقت کی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مافوق الفطرت تبلیغ ایسا ہی خوف ناک ہے جیسا نسل پرستی پر مبنی پروپیگنڈا ہوسکتا ہے۔

سائنس فکشن کی ایک اور ناجائز شکل وہ ہے جس میں طبیعات دانوں کو جادوگروں کے شانہ بشانہ کام کرتے دکھایا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنس اور جادو کو پہلو بہ پہلو لاکر سائنس کی کوئی خدمت نہیں کی گئی۔

ہماری عمومی اور مؤثر سائنس کا پری کہانی کے جادوئی منتروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بنیاد بنا کر دنیا کو مترتب نظام ماننے پر ہے۔ بلاشبہ اسرار موجود ہیں لیکن ان اسرار کو بالآخر واضح ہونا ہے۔ میز پر رکھی اینٹ کو حرکت دینے کے لیے قوت لگانا ناگزیر ہے۔ سائنس فکشن قوانین فطرت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا متحمل

ہوسکتا ہے لیکن دانش مندانہ طرزِعمل یہی ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک قانون کو چھیڑا جائے۔ لیکن ایسے سائنس فکشن کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو قانون کے جواز ہی کو چیلنج کردے۔ سائنس فکشن میں سوچنے سمجھنے اور باشعور کمپیوٹر کی گنجائش موجود ہے۔ زماں کو لپیٹ دینے کا تصور استعمال کرتے ہوئے کہکشاؤں کے درمیان پلک جھپکتے سیر کرادینا بھی جائز ہے، لیکن ان دونوں مثالوں میں سائنسی طرزِ کار پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ سائنس سریت کی اجازت دیتی ہے لیکن جادو کی نہیں۔ تخیل کی پرواز کیسی ہی بلند کیوں نہ ہو، لیکن منتر، جادوگری اور معجزے کی گنجائش اچھے سائنس فکشن میں نہیں ہونی چاہیے۔ غیر سائنسی رویے کی ایک اور مثال پیرانارمل کا تعارف ہے۔ عوام الناس میں باطل سائنسوں کی مقبولیت ایک اعتبار سے خود کن بھی ہے۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ لوگوں میں احساسِ تحیر موجود ہے اور وہ اس کی تسکین کے لیے باطل سائنس کا سہارا لیتے ہیں۔ ایکس فائلز نامی پروگرام کی مقبولیت اپنی جگہ لیکن یہ قوانینِ فطرت کو باطل دکھانے کے لیے کیمرہ ٹرک (Trick) کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر آڈن (Auden) سے رجوع کرتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ سائنس دانوں کو بالعموم انوکھی مخلوق تصور کیا جاتا ہے۔ میری اپنی یونیورسٹی میں سائنس میں گریجویشن کرنے والوں کو شکایت ہے کہ ان کے مضمون کو بالعموم ''ماٹھا'' سمجھا جاتا ہے۔ اس طرزِعمل کا تجربہ مجھے ذاتی طور پر ہوا۔ ایک بی بی سی ٹیلی ویژن کے پروگرام میں مجھے ایک نوعمر اور مستعد میزبان خاتون سے واسطہ پڑا۔ اس نے خود مانا کہ آکسفورڈ میں دورانِ تعلیم کوئی ایک سائنس دان بھی اس کے ملنے جلنے والوں میں شامل نہیں تھا اور وہ قدرے سراسیمہ نظر آتی تھی۔ اس کے شناساؤں کے حلقے نے بھی انھیں قدرے دور سے دیکھا تھا اور ان پر ترس کھاتے تھے کہ وہ لنچ سے پہلے ہی جاگ اٹھتے ہیں۔ انھیں ان کی یہ عادت عجیب لگتی تھی کہ وہ نو بجے کے لیکچر کے بعد سارا دن تجربہ گاہ میں گذار دیتے ہیں۔ جواہر لال نہرو، بطور بشر نواز مشہور رہے ہوئے۔ سائنس کے متعلق ان کے خیالات زیادہ حقیقت پسندانہ ہیں۔

''بھوک اور غربت، جہالت اور صحت دشمن حالات، توہم پرستی اور مہلک رسم و رواج، وسائل کے ضیاع یا امیر ملک کے فاقہ کش باشندوں کے مسائل کا حل؛ صرف سائنس میں ہے۔ سائنس کی ضرورت سے آج کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ ہمیں ہر قدم اور ہر موڑ پر اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مستقبل انھی کا ہے جو سائنس کے ساتھ شناسائی پیدا کریں گے۔''

یہ امر بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مطلق علم اور افادیت ہر دو طرح سے بعض اوقات سائنس دان خود پرست ہوجاتے ہیں۔ جینیات کے عظیم ماہر لیوس وولپرٹ (Lewis Wolpert) کو اعتراف ہے کہ سائنس بھی موقعہ بہ موقعہ قدرے متکبرانہ رویہ روا رکھتی ہے۔ پیٹر میڈ اور کارل سیگاں اور پیٹر ایٹکنز نے بھی ملتی جلتی باتیں کی ہیں۔

سائنس کا اپنا رویہ اپنی جگہ لیکن ہمیں یہ اعتراف تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ سائنس میں ترقی کا عمل خود احتسابی کی مدد سے آگے بڑھتا ہے۔ طیوریات کے بانی کانرڈ لورینز نے بھی ایک بار مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ وقت آنے والا ہے جب میں ہر صبح ناشتے سے پہلے کم از کم ایک نظریہ باطل کروں گا، لیکن یہ

امر بھی اپنی جگہ درست ہے کہ وکیلوں، ڈاکٹروں اور سیاست دانوں کے مقابلے میں سائنس دان اپنی غلطی کا اعتراف اپنے حلقوں میں زیادہ فراخ دلی سے کرتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں گریجویشن کے دنوں میں امریکہ سے آنے والے ایک لیکچرر نے شواہد پیش کیے کہ ہمارے شعبۂ حیوانات کے نہایت معزز سربراہ کا ایک نہایت دل پسند نظریہ غلط ہے۔ یہ نظریہ ہم سب پڑھتے آئے تھے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ چلتا ہوا اس لیکچرر تک پہنچا اور اس کے ساتھ گرم جوش مصافحہ کیا اور کہنے لگا، ''آپ کا بے حد شکریہ، میں پندرہ سال سے غلطی کا شکار چلا آرہا ہوں۔'' تالیاں پیٹتے ہوئے ہاتھ سرخ ہوگئے۔ کیا کسی دوسرے شعبۂ حیات میں بھی غلطی کا ایسا فراخدلانہ اعتراف کیا جاتا ہے؟ سائنس کی ترقی کا راز ہی یہی ہے کہ اس نے اپنی غلطیوں کو جانا اور انھیں درست کیا۔ سائنسی اپنی لاعلمی کو کبھی نہیں چھپاتی لیکن پروپیگنڈا اس کے بالکل برعکس کیا جاتا ہے۔ لندن کے "The Times" میں برنارڈ لیون سائنس کے خلاف متواتر لکھتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۹۶ کے ایک شمارے میں اس کا مضمون "God, me and Dr. Dawkins" چھپا۔ اس کے ساتھ چھپے ایک کارٹون میں مائیکل اینجلو کی تصویرِ آدم دکھائی گئی تھی۔ مضمون نگار نے ذیلی عنوان یوں دیا، "سائنس دان نہیں جانتے اور نہ ہی میں۔ لیکن مجھے کم از کم اتنی خبر ضرور ہے کہ میں نہیں جانتا۔" کارٹون میں مائیکل اینجلو کے آدم کی جگہ مجھے دکھایا گیا تھا اور میں خدا کی انگلی کا مخاطب تھا۔ اس طرزِعمل پر میرے سمیت کوئی بھی سائنس دان شدید احتجاج کرے گا لیکن سائنس کا مقصد ہی یہ معلوم کرنا ہے کہ ہم کیا نہیں جانتے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں کھوج کے لیے تحریک فراہم کرتا ہے۔ اپنے ۲۹ جولائی ۱۹۹۴ کے کالم میں برنارڈ لیون نے ''کوارکوں'' کے تصور کا مذاق اڑایا ہے؛ ''کوارک آئے! کوارک آئے! بھاگو اپنی جان بچاؤ!'' وہ قدرے مزاحیہ انداز میں موبائل، ٹیلی فون، قابلِ تہہ چھتریوں اور کثیر رنگی ٹوتھ پیسٹ جیسے سائنس کے احسانات گنوانے کے بعد نہایت سنجیدگی سے سائنس کی مذمت کرنا شروع کردیتا ہے، ''کیا آپ کوارک کھاسکتے ہیں؟ کیا آپ انھیں توڑ کر سرما کی سردی سے بچ سکتے ہیں؟'' اس طرح کی کوئی چیز اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کا جواب دیا جائے۔ اس کے باوجود کیمبرج کے دھات کاری کے ماہر نے مذکورہ بالا اداریہ چھپنے کے دو ایک دن بعد ایڈیٹر کو دوسطری خط لکھا:

''جناب ایڈیٹر صاحب! مسٹر برنارڈ لیون نے پوچھا ہے: 'کیا تم کوارک کھاسکتے ہو؟' میرے ایک اندازے کے مطابق وہ خود بھی روزانہ کوئی ۱۰۔۲۵ کوارک کھاجاتے ہیں۔''

یہ درست ہے کہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کرلینا بھی ایک خوبی ہے لیکن جس جہالت کا اظہار برنارڈ لیون نے کیا، وہ کسی بھی ایڈیٹر کے لیے قابلِ برداشت نہیں ہونا چاہیے۔ بعض ایسے حلقے بھی ہیں کہ سائنس سے اپنی بے خبری کو اپنی ذہانت اور چالاکی جانتے ہیں، بصورت دیگر لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلی گراف کے ایک چھوٹے سے مذاق کی توجیہ بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ اخبار ششدر کردینے والا ایک سروے کا نتیجہ شائع کررہا تھا کہ برطانیہ کے ایک تہائی لوگ اب بھی سورج کو گردش میں مانتے ہیں۔ اس جگہ ایڈیٹر نے اپنی طرف سے ایک سرخی لگائی کہ ''واقعی ایسا نہیں ہے۔'' اگر اسی طرح کے کسی سروے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "The Illead" شیکسپیئر نے لکھی ہے اور برطانیہ کے ایک تہائی لوگ اس پر یقین کرتے پائے جاتے تو کوئی بھی ایڈیٹر اس پر ایسی

گھٹیا ظرافت طبع کا مظاہرہ نہ کرتا۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سائنس سے بے خبری اور ریاضی میں نالائقی کا فخریہ دعویٰ سماجی سطح پر قابل قبول ہو چکا ہے۔ برطانیہ میں فنون لطیفہ کے نامور مصنفین میں سے ایک میلون بریگ (Melvyn Brage) نے ۱۹۹۸میں چھپنے والی اپنی کتاب"On Giant's Shoulder" میں لکھا ہے ''اور پھر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھیں یہ کہنے کا شوق ہوتا ہے کہ وہ سائنس کے متعلق کچھ نہیں جانتے، گویا اس طرح کا طرز عمل بھی اپنی برتری کا ایک طریقہ ہے۔ حالاں کہ یہ رویہ ان کی حماقت کا اظہار ہے۔اور وہ برطانیہ کی تھکن زدہ اس قدیم روایت کے عین کنارے پر جا لگتے ہیں جو تمام علم اور خصوصاً سائنس کو ٹریڈ سمجھتے ہیں۔''

سر پیٹر میڈاور نے کہا تھا،''کہا جاتا ہے کہ قدیم چین کے باشندے اپنی پوری یا کچھ انگلیوں کے ناخن انتہائی لمبے کر دیتے تا کہ جسمانی کام کے حوالے سے اپنی معذوری کا اظہار کر سکیں اور یہ ثابت کر سکیں کہ انھوں نے ایسے بلند مقام پر زندگی گذاری ہے کہ کسی طرح کی جسمانی محنت و مشقت میں ملوث نہیں ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کا انداز فکر اہل برطانیہ کو یقیناً پسند آئے گا۔ برطانوی لوگوں کو تفاخر میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بحیثیت ایک قوم ہمیں اطلاقی سائنس سے چڑ ہے اور ٹریڈ انگلینڈ کو اس کے موجودہ مقام تک لانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔''("The limits of science"،مطبوعہ۱۹۸۴سے مقتبس)

لوگ سائنس سے بے رخی میں بہت نچلی سطح پر اتر آتے ہیں۔ڈیلی ٹیلی گراف میں چھپنے والا ایک مضمون اسی رویہ کا اظہار ہے۔مضمون نگار لکھتی ہے:''یہ توقع نہ رکھنا کہ ہم تمھیں پسند کریں گے۔تم نے ہم سے بے شمار وعدے کیے اور انھیں پورا کرنے میں ناکام رہے۔ جب ہم پوچھتے تھے تو تم نے ہمارے سوالوں میں سے کسی ایک کا جواب بھی نہیں دیا بلکہ جواب دینے کی کوشش بھی نہیں کی۔مرنے کے بعد آنٹی ماڈ کہاں چلی گئی؟ پیدا ہونے سے پہلے وہ کہاں تھی؟''

آپ نے دیکھا کہ یہ الزام برنارڈ لیون کے الزام سے بالکل مختلف ہے۔اگر میں آنٹی ماڈ کے متعلق ان دونوں سوالوں کا سادہ جواب دینے کی کوشش کروں گا تو کہا جائے گا کہ میں اپنے مضمون کی حدود سے باہر نکل رہا ہوں اور مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ میں سائنس کی متعینہ حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔مِس ویلڈن اپنی بات کو یوں آگے بڑھاتی ہے:

''آپ سمجھیں گے کہ یہ سوالات احمقانہ اور دِق کرنے والے ہیں لیکن مجھے انھی میں دلچسپی ہے۔ اس میں کس کو دلچسپی ہو سکتی ہے کہ بِگ بینگ کے آدھے سیکنڈ کے بعد کیا ہوا؟ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ آدھا سیکنڈ پہلے کیا تھا؟ اور پھر فصلوں میں لگے دائروں(Crop Circles) کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بس اتنی سی بات ہے کہ سائنس دان متغیر کائنات کا سامنا نہیں کر سکتے، جب کہ ہم کرتے ہیں۔''

انھوں نے کسی جگہ وضاحت نہیں کی کہ ان کے اس سائنس خلاف ''ہم'' میں کون کون شامل ہیں؟ اور ممکن ہے کہ انھیں اپنے اس انداز تحریر پر افسوس بھی ہو لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ پیدا کہاں سے ہوا؟

سائنس خلاف رویہ کی ایک اور مثال کا تعلق بھی ایک کالم نویس اے۔اے۔گل سے ہے۔ممکن

ہے کہ یہ صاحب اپنی بات میں مزاح پیدا کرنا چاہتے ہوں لیکن ان کا یہ مزاح سائنسی طرز کار کی تحقیر کی قیمت پر نمودار ہوتا ہے۔ وہ سائنس کو تجربہ میں محدود ہونے کا طعنہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی تجربیت پسندی موٹے موٹے اصولوں کو بیان کرتے ہوئے جزئیات و تفاصیل چھوڑ جاتی ہے۔اپنی بات کی وضاحت کے لیے وہ سائنس کا تقابل آرٹ، تھیٹر اور روشنی کے اثرات سے کرتا ہے۔۱۹۶۷میں بیل اور ہیوش کے ہاتھوں پلزاروں کی دریافت کا ذکر کرتے ہوئے وہ ان کا حوالہ مدھم اور جلتے بجھتے نقطوں کے طور پر دیتا ہے۔دراصل گل ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام پر ریویو لکھ رہا تھا، جس میں ماہر فلکیات جوسیلن بیل شریک تھی اور اپنے اس لمحے کا ذکر کر رہی تھی جب اس نے ہیوش کے ریڈیو دوربینی نتائج کا پرنٹ دیکھا اور اس نے وہ اجسام دریافت کیے جو اس سے پہلے سننے میں نہیں آئے تھے۔ایک نوجوان خاتون جسے اپنے شعبۂ تحقیق کا کچھ زیادہ ادراک نہیں تھا، وہ کاغذ کے ٹکڑے پر وہ کچھ پڑھ رہی تھی جو انقلاب انگیز ثابت ہونا تھا۔اس نے کائنات میں ایک بالکل نئی طرح کے سیارے کا سراغ لگایا۔ ہمارا سیارہ یعنی کرہ ارض اپنے محور کے گرد چوبیس گھنٹے میں ایک گردش پورا کرتا ہے، جب کہ پلزار یہی کام سیکنڈ کے نہایت چھوٹے حصوں میں کرتا ہے۔ہمیں پلزاروں کی خبر دینے والی روشنی کی کرن لائٹ ہاؤس کی روشنی کی طرح وقفے وقفے سے ہمارے آلات کو نہلاتی ہے۔ روشنی کے وقفے اتنی باقاعدگی سے گذرتے ہیں کہ ہمارا کوارٹرز کرسٹل بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ہم تک پہنچنے میں اس روشنی کو دسیوں لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔ کیا گل یہ بتانے کی زحمت کرے گا کہ اس میں تجربیت کی خشکی اور یاسیت کہاں ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ سائنس سے یہ فخریہ بیگانگی ہمارے معاشرے کے ایک خاص طبقے کا اعلانیہ رویہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رویہ پیغامبر کو قتل کرنے کا عام رجحان یا سائنس کے ہائیڈروجن بم جیسے سیاسی غلط استعمال کی پیداوار نہیں۔جس دشمنی کا میں نے ذکر کیا ہے، میرے نزدیک اجتماعی سے زیادہ ذاتی رنج کا نتیجہ ہے۔ممکن ہے کہ ان کے لیے سائنس پر حاوی ہونا مشکل ہو اور وہ اپنی شکست سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے اسے اپنی مسلسل تذلیل خیال کرنے لگے ہوں۔آکسفورڈ میں انگریزی ادب کے پروفیسر جان کیری نے ۱۹۹۵میں شائع ہونے والی اپنی قابل تعریف کتاب"Faber Book of science" میں لکھا:

''برطانوی یونیورسٹیوں میں آرٹس کے کورسوں میں داخلے کے لیے ہر سال بڑھتا ہوا ہجوم اور سائنس کے داخلے کی کم ہوتی ہوئی درخواستیں اس امر کا تعین کرتی ہیں کہ نوعمر لوگوں میں سائنس ترک کر دینے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔اگرچہ درس گاہوں کے کرتا دھرتا اس امر کا سیدھا صاف اقرار نہیں کرتے لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ آرٹس کے کورسوں کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ انھیں آسان سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی ہے کہ آرٹس کے زیادہ تر طالب علموں کی ذہنی سطح سائنس کے کورسوں کے تقاضے پر پوری نہیں اترتی۔''

ممکن ہے کہ ریاضیاتی سائنسوں میں سے کچھ واقعی مشکل ہوں لیکن جسم میں خون کی گردش اور اس میں دل کے کردار کی تفہیم تو کسی طرح مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ کیری اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک

واقعہ بیان کرتا ہے کہ اس نے ایک بڑی برطانوی یونیورسٹی کے آخری سال کے تیس انڈر گریجویٹوں کو جان ڈن کی یہ سطور پڑھ کر سنائیں:

"Knows't thou how blood which to the heart doth flow, doth one ventricle to the other go?"

بعدازاں کیری نے ان سے پوچھا کہ خون کس طرح ایک سے دوسرے ونٹریکل میں بہتا ہے؟ تیس میں سے ایک نے بھی جواب نہیں دیا۔ البتہ ایک نے اندازاً بتایا کہ یہ بہاؤ اوسموسز کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ یہ جواب صرف غلط نہیں بلکہ کند ذہنی کا عکاس بھی ہے۔ خون جن عروق شعریہ میں دوڑتا ہے اور دل اسے پمپ کرتا ہے، ان کی لمبائی کل کوئی پچاس میل بنتی ہے یعنی خون کو ایک ونٹریکل سے دوسرے ونٹریکل میں جانے کے لیے کوئی پچاس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر پچاس میل لمبائی کی ان ٹیوبوں کو سمیٹ کر انسانی جسم کے اندر رکھنا پڑے تو آپ فوراً اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر کی دیوار کتنی باریک ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی صاحب علم شخص اس فکر کے سحر سے آزاد نہیں ہوسکتا اور پھر کوانٹم یا نظریہ اضافیت کے برعکس اسے سمجھنا بہت آسان ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکول کی سطح پر ڈیزائن کیا گیا کوئی بھی تجربہ ان کے اندر مناسب احساس تحیر بیدار کرسکتا ہے، بشرطیکہ ان کی ذہانت مثبت انداز میں استعمال ہو اور اسے کسی اور طرح کی عیاری میں نہ برتا جائے۔

ابھی حال ہی میں، میں نے برطانوی تمدن میں سائنس کے متعلق ایک ٹیلی ویژن پروگرام کیا اور اس پر اے۔ اے۔ گل نے ہی ریویو لکھا۔ بہت سے تعریفی خطوط ملے، البتہ ایک خط خاصا طنزیہ تھا اور کسی استاد نے لکھا تھا، جسے اسکول کے زمانے کے سائنس کے اسباق میں سے فقط بنسن برنر کا مطالعہ یاد رہ گیا تھا۔ یہ صاحب بچوں کو شہنائی سکھاتے ہیں۔ خط پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ شہنائی نہ بجانا آتی ہو تو بھی موزارٹ سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ بھی بجانا نہ آتا ہو، تب بھی آپ موسیقی کا ماہرانہ ذوق پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اگر اسے کوئی بھی بجانا نہ سیکھے تو موسیقی مر جائے گی، اس کے برعکس اگر ہر کوئی یہ سمجھنے لگے کہ موسیقی کا مطلب فقط بجانا ہے تو اس کا حال بتانا مشکل نہیں ہوتا۔

کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ سائنس پر بھی اسی طرح سوچا جائے۔ یقیناً یہ امر نہایت اہم ہے کہ ہمارے ذہین ترین لوگوں کو سائنس باقاعدہ پیشہ ورانہ سطح پر پڑھنی چاہیے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جس طرح ہم شہنائی کا درس لیے بغیر اسے سن سکتے ہیں، اسی طرح ہم سائنس کو عمل میں لائے بغیر اس کی مدد سے اکتشافی حسوں کی تسکین کر سکتے ہیں۔ یقیناً سائنس کی تدریس کے ہمارے بہترین اذہان کو وابستہ رہنا چاہیے اور عملاً اس کی کھوج میں اپنی صلاحیت صرف کرنا چاہیے۔ لیکن کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم سائنس کو عمل میں لائے بغیر اس سے لطف اندوز ہونا سیکھ لیں جیسے ادب، فلم اور موسیقی میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیکسپیئر سے لطف اندوز ہونے کے لیے کیٹس ہونا ضروری نہیں ہے۔ کیٹس بھی تشریح الابدان سے بھاگ گیا لیکن اسے کون الزام دے سکتا ہے۔ ڈارون نے بھی یہی کیا۔ کیٹس کو پڑھانے والے تدریس کی کم عملی سطح پر سمجھوتہ کر لیتے تو ممکن تھا کہ

سائنس اور نیوٹن کے متعلق کیٹس کا رویہ کم تنقیدی ہوتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ "The Times" کے ایڈیٹر سائمن جینکنز کے متعلق بات کرنے کا مناسب موقعہ ہے۔ سائنس کا یہ ناقد مذکورہ بالا ناقدین کے مقابلے میں زیادہ معروف ہے۔ اسے قدرے سنجیدگی سے لینا پڑے گا، کیوں کہ یہ جانتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ سائنس کی کتابیں فکر کی محرک ہوسکتی ہیں لیکن اسے اعتراض ہے کہ سائنس کو خاصے اونچے درجے (Level) پر لازمی قرار دیا جاچکا ہے۔ اس کے ساتھ میری ایک گفتگو ۱۹۹۶ میں ہوئی تھی۔ اس کا کہنا ہے:

''میں سمجھتا ہوں میری نظر سے سائنس کی چند کتابیں گذری ہوں گی، جنھیں مفید قرار دیا جاسکتا ہے، ہاں البتہ وہ حیرت انگیز ضرور تھیں۔ انھیں پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گردوپیش کی دنیا اس سے کہیں زیادہ بھرپور، حیرت انگیز اور ششدر کن ہے، جتنا میں اسے خیال کرتا رہا ہوں۔ کم از کم میرے لیے وہ کتابیں فقط احساس حیرت کا سبب بنی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں میں سائنس فکشن کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے۔ میرے خیال میں سائنس کے پاس بتانے کو بہت ساری کہانیاں ہیں لیکن سائنس ویسی مفید نہیں ہے۔ یہ ان معنوں میں مفید نہیں ہے جن معنوں میں بزنس یا قانون کا مطالعہ ہے بلکہ سیاست اور اقتصادیات کا مطالعہ بھی اس سے زیادہ مفید ہے۔''

جینکنز کا یہ کہنا کہ سائنس مفید نہیں، ایسی طرفگی طبع ہے کہ میں اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر آگے نکل جانا چاہتا ہوں۔ سائنس کے سخت ترین ناقد بھی اس کی افادیت کو مانتے ہیں بلکہ اسے ضرورت سے بھی کچھ زیادہ افادی قرار دیتے ہیں اور یہ تو خود جینکنز بھی تسلیم کرتا ہے کہ سائنس جذبۂ حیرت کو تحریک دیتی ہے۔ البتہ ایک اور نقطۂ نظر کی نمائندگی برطانوی صحافی بریان اپیل یارڈ کرتا ہے جس نے ۱۹۹۲ میں لکھا کہ ''سائنس روح کو کچل دیتی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اصل ترک کر دیں۔'' اس کا یہ خیال مجھے ایک بار پھر کیٹس اور اس کی قوس قزح کی طرف لے جاتا ہے اور ہم اگلے باب سے رجوع کرتے ہیں۔

[''سائنس اور شعری جمالیات''، رچرڈ ڈاکنز، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۵]

قارئین سے خصوصی درخواست

'اثبات' کی انتظامیہ میں تبدیلی ہونے کے سبب اس کا پتہ بھی بدل چکا ہے، نیا پتہ رسالے کے پہلے صفحہ پر درج ہے۔ زرسالانہ بھی اسی پتے پر ارسال کریں۔ جو حضرات چیک، ڈرافٹ یا بینک ٹرانسفر کے ذرائع کا استعمال کرنا چاہتے ہیں، اس کی تفصیلات پرچے کے دوسرے صفحے پر موجود ہے۔ امید ہے قارئین کرام، انتظامیہ سے تعاون کریں گے، شکریہ۔

انتظامیہ

دانیال طریر کی چار غزلیں

جنت کے پھل زمیں پہ گرانے کی دیر تھی
اک بار آسمان ہلانے کی دیر تھی

میں پیڑ میں قیام کروں گا تمام عمر
یہ بات طائروں کو بتانے کی دیر تھی

یہ رمز مجھ پہ غیر کا احسان جانیے
اس دل میں ایک پھول کھلانے کی دیر تھی

اس چشم نیم ناز کی خوابیدگی کی خیر
جیسے اسے یہ خواب سنانے کی دیر تھی

افلاک چاک ہونے لگے چاند شق ہوا
شاید مرے چراغ جلانے کی دیر تھی

پھر میں تھا اژدھوں کا علاقہ تھا خوف تھا
اپنی طرف خدا کو بلانے کی دیر تھی

تجھ تک پہنچنے میں مجھے صدیاں لگیں مگر
میری نہیں تھی یہ تو زمانے کی دیر تھی

آتشیں لہر نہ برفاب میں رکھی جائے
شب غنودہ مرے اعصاب میں رکھی جائے

جس کے کردار پرندوں کی طرح اڑتے ہوں
وہ کہانی مرے اسباب میں رکھی جائے

غار در غار بھٹکتے ہوئے میں چیخ اٹھا
روشنی اب کسی محراب میں رکھی جائے

آنکھ لگ جائے تری چاند کی لوری سن کر
پھر تری نیند مرے خواب میں رکھی جائے

اتنا آسان نہیں میرا جنونی ہونا
تیری تصویر بھی مہتاب میں رکھی جائے

جس جگہ پھول کے بھی پنکھ ہوں تتلی کی طرح
آنکھ اس قریۂ شاداب میں رکھی جائے

کوئی سوائے بدن ہے نہ ہے ورائے بدن
بدن میں گونج رہی ہے ابھی صدائے بدن

عجب ہے شہر مگر شہر سے بھی لوگ عجب
ادھار مانگ رہے ہیں بدن برائے بدن

جہاں ٹھٹھرتی تمنا کو آگ تک نہ ملے
وہاں پہ کون ٹھہرتا ہے اے سرائے بدن

کہیں چمکتی ہوئی ریت بھی دکھائی نہ دے
کہاں گیا وہ سمندر سراب کھائے بدن

چراغ بن کے چمکتے ہیں روز شام ڈھلے
ہمارے پہلو میں سوئے ہوئے پرائے بدن

ہر ایک راہ میں بکھرے پڑے ہیں برگ نفس
یہاں چلی ہے بہت دن تلک ہوائے بدن

وہ اپنی قوس قزح لے گیا تو کیا ہوگا
طریر غور طلب ہے تری فضائے بدن

کھنڈر یہ پھر بسانے کا ارادہ ہی نہیں تھا
بدن میں لوٹ آنے کا ارادہ ہی نہیں تھا

شکم کی آگ نے بیلوں کو ہنکانا سکھایا
وگرنہ ہل چلانے کا ارادہ ہی نہیں تھا

وہ اپنے بھیڑیوں کو سیر پر لایا تھا بن میں
غزالوں کو ڈرانے کا ارادہ ہی نہیں تھا

کہا تھا طائروں نے پیڑ کو دیمک لگی ہے
کسی کو آزمانے کا ارادہ ہی نہیں تھا

خبر کب تھی کہ آنکھیں اوس برسانے لگیں گی
تجھے ورنہ جگانے کا ارادہ ہی نہیں تھا

میں تیرے ساتھ اڑتا پھر رہا تھا آسماں میں
خدا کو بھول جانے کا ارادہ ہی نہیں تھا

صدی بھر میں تمناؤں کو بال و پر دیے تھے
مگر ان کو اڑانے کا ارادہ ہی نہیں تھا

دو مٹکے فارسی

جمیل احمد خاں

دنیا کی کوئی بھی زبان اپنی بے شمار خوبیوں کے باوجود عیب اور خامیوں سے خالی نہیں۔ دنیا کی کسی بھی زبان کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خامیوں سے بالکل پاک ہے۔ کسی کی لکھائی بہت پیچیدہ ہے تو کسی کے قواعد انتہائی مشکل ہیں اور کسی میں بعض مخصوص آوازیں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً انگریزی زبان میں ت، ڑ، غ اور ق کی آوازیں نہیں ہیں۔ فارسی زبان میں ٹ، ڈ اور ڑ کی آوازیں موجود نہیں، جبکہ عربی زبان میں ٹ، پ، ج، ڈ، ڑ اور گ کی آوازیں نہیں ہیں۔ سندھی، ہندی اور اردو زبان میں سب سے زیادہ آوازیں ہوتی ہیں۔ ہمیں انگریزی زبان سے کچھ الرجی سی رہی ہے۔ بھلا بتایئے کافروں کی زبان ہے، ایک مومن مسلمان کے قلب میں نجس لوگوں کی زبان کہاں سے سمائے گی؟ یہ تو آج کل زمانہ ہی خراب ہوگیا ہے، قیامت کی گھڑی بس آیا ہی چاہتی ہے، اسی لیے جگہ جگہ انگریزی اسکول کھل گئے ہیں، ورنہ جب مردِ مومن حضرت ضیاالحق کا دور دورہ تھا تو انھوں نے قوم کو مکروہات، بدعات اور کفریہ رسومات سے دور کرنے کے لیے جہاں اور بہت سے اقدامات کیے، وہیں پاکستانیوں کو گوروں کی اس منحوس زبان سے تاقیامت محفوظ رکھنے کے لیے بھی راست اقدام فرمایا۔ ہم شاید اس وقت دوسری جماعت کے طالب علم رہے ہوں گے۔ ایک تو حضرت نے اس سال تمام طالب علموں کو بغیر امتحان دیے ہی اگلی کلاس میں پہنچوا دیا، دوسری مہربانی یہ کی کہ انگریزی زبان کو پرائمری جماعتوں سے ختم کردیا، یعنی جو کچھ ہم نے پہلی جماعت میں پڑھا تھا، وہی کچھ چار سال کے وقفے کے بعد چھٹی جماعت میں ہمیں پڑھایا گیا۔ ایک خصوصی اقدام یہ بھی کر گئے حضرت، کہ میٹرک کے کورس میں انگریزی کی کتاب اسی سطح کی رہی جس سطح کی پہلے تھی۔ چنانچہ آٹھویں جماعت کے بعد طالب علموں کو نویں جماعت میں داخل ہونے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ کسی فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اچانک گٹر میں جا گرے ہوں۔ اس طرح طالب علموں کو یا تو انگریزی سے شدید نفرت ہوجاتی تھی یا پھر انگریزی کا خوف بھوت بن کر ساری زندگی ان کے ذہن سے چمٹ جاتا تھا۔ کس قدر نیک کام کیا حضرت موصوف نے کہ ہماری نسل کے بیشتر لوگ سوائے ہمارے جو بزرگ ہوچکے ہیں، انگریزی جیسی منحوس زبان

سے دور دور ہیں اور کافروں کی دست برد سے بچے ہوئے ہیں۔ دور تو ہم بھی بہت ہیں اس کلموہی انگریزی سے، بس ہم بزرگ نہیں ہوئے ہیں۔ خدانخواستہ انگریزی زبان اگر سمجھ جاتے تو کافروں کے علوم پڑھتے اور ایمان خراب کرتے۔ ایمان تو کسی صورت خراب نہیں ہونا چاہیے، بھلے سے زندگی خراب ہو، نیت خراب ہو، دل خراب ہو، شلوار خراب ہو وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی کس قدر اوٹ پٹانگ زبان ہے، یہ تو گوروں کو حضرت برنارڈ شا سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے مر گئے، اسی لیے ہم مسلمان انھیں نہایت احترام کے ساتھ شاہ جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ برنارڈ شا کہتے تھے کہ انگریزی زبان کے لفظ Fish یعنی مچھلی کو Ghoti گھوٹی بھی لکھا جاسکتا ہے۔ جناب گورے تو ٹھہرے عقل کے کورے؛ شاہ جی کی روحانی حکمت کو سمجھ ہی نہیں سکے اور لگے ان کا مذاق اڑانے۔ پھر حضرت برنارڈ شا نے نہایت تحمل کے ساتھ سمجھایا کہ ارے نالائقو! بے وقوفو! انگریزی میں ف یا F کی آواز کے لیے کبھی کبھی GH کے حروف بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے Laugh، Enough! اسی طرح O کبھی کبھی I کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے، جیسے Women، جب کہ TI کے حروف SH کی آواز دیتے ہیں، مثال کے طور پر Nation، جس میں TI کے حروف SH کی آواز کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ F کی جگہ.... IGH کے بجائے O اور SH کے بدلے TI کے حروف استعمال کرکے Fish کو Ghoti بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ ان عقل کے کوروں یعنی گوروں نے شاہ جی کی بات پر توجہ نہیں دی، اگر وہ حضرت برنارڈ شا کے نسخے پر عمل کرتے تو دنیا میں نہ سہی آخرت میں تو ضرور کامیاب ہوجاتے۔ حضرت برنارڈ شا بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے، کہاں کہاں پہنچے، اس کا تو ہمیں علم نہیں؛ البتہ ہمارے دوست نون کا کہنا ہے کہ وہ قبلہ بڑے حکیم صاحب عرف بڑے شاہ جی سے فیض یافتہ واجازت یافتہ تھے۔ اجازت، بڑے شاہ جی نے گھر کے مردانے میں ضرورتاً آنے جانے کی دی تھی لیکن برنارڈ شاہ جی، حضرت بڑے حکیم عرف بڑے شاہ جی کے گھر کے زنانے میں گھسنے لگے۔ بڑے شاہ جی نے یہ کیفیت دیکھی تو ولایت بھجوا دیا کہ جو کچھ کرنا ہے گوروں میں کرو، چنانچہ برنارڈ شاہ جی نے گوروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھالیا، وہ تو کچھ گورے ہی ڈھیٹ نکلے اور ان پر شاہ جی کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا، ورنہ تو انگلینڈ بھی اسلام کے جھنڈے تلے آجاتا۔ حضرت ضیاالحق اب اس دنیا میں نہیں رہے اور اُس دنیا میں بھی پہنچ پائے یا نہیں؛ اس کا کوئی تصدیقی خط اب تک تو موصول نہیں ہوسکا، لیکن حضرت کے فیض یافتہ اور حواس باختہ بعض اہل علم وادب جن کا ادب اب کہیں نہیں کیا جاتا، اردو زبان کو کافروں کی زبان سے محفوظ و مامون رکھنے کے لیے اردو کی ہتھیلی پر فارسی اور عربی کی سرسوں جمانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ انھی اہل علم وادب اور ماہرین لسانیات کو نئی نسل سے یہ شکایت ہے کہ وہ اردو زبان میں انگریزی کی آمیزش کرتے چلی جارہی ہے۔ ہمیں ان اہل علم وادب سے لاکھ شکایت رہی ہو لیکن ہم اپنی نسل کے نوجوانوں سے، ارے بھئی ہم اتنے بھی پرانے نہیں ہوئے کہ پرانی نسل میں شمار ہوں؛ معذرت کے ساتھ اتنا ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ ایک حد تک تو ان اہل علم وادب کی شکایت جائز معلوم ہوتی ہے کہ جہاں اردو کا لفظ موجود ہے تو پھر انگریزی لفظ کا اردو بول چال اور لکھت پڑھت میں استعمال کیوں کیا جاتا ہے؟ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس ضمن میں سب سے بڑا مسئلہ خود بعض اہل ادب اور ماہر لسانیات ہیں جو اردو کو

خالص کرنے کی کوشش میں اس قدر چھان پھٹک کر دیتے ہیں کہ کنکر پتھر کے ساتھ اصل اناج بھی نکل جاتا ہے۔ جی ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ کمپیوٹر کی ماں کا تختہ یا تخت مادر (Mother Board) سے تو ہم آپ کو پہلے ہی متعارف کروا چکے ہیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ آل لمسی قرص کیا چیز ہے؟ ارے نہیں جناب! یہ آل تزکیہ نفس کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ نہیں نہیں یہ تصوف کی کوئی اصطلاح بھی نہیں ہے اور نہ ہی یہ قبلہ بڑے حکیم صاحب کی ایجاد کردہ دوا ہے جو فولادی قوت کے حصول کے لیے استعمال کرائی جاتی ہے۔ یہ تو ضیاالحقویانہ دور میں مسمیرائز ہونے والے اہل علم وادب نے ٹچ ٹیبلیٹ Touch Tablet کو مسلمان کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے، اور کلیدی تختہ، میت نہلانے کا تخت ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ آپ کے کمپیوٹر کا کی بورڈ Key Board ہے۔ برقیاتی تحریک، تحریک انصاف کی طرز کی کسی جماعت کا نام نہیں یہ Electronic Pulses کا اسلامی نام ہے۔ اگر آپ اناٹومی Anatomy اردو میڈیم میں پڑھ رہے ہیں تو آپ کو بعض اوقات یوں محسوس ہوگا کہ گویا حافظ یا مولانا روم کی رباعی پڑھ رہے ہیں، مثلاً مخاطی تہہ، اثناعشری، طبقہ مخاطی، ماساریقا، طبق مصلی؛ دراصل بالترتیب Serous Layer، Mesentery، Mucous Layers، Duodenum، Submucosa ہیں، جو چھوٹی اور بڑی آنتوں کے مختلف حصوں کے نام ہیں۔ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ہمیں ذہن اور دماغ کے موضوع پر کچھ معلومات درکار تھیں، ان ہی دنوں پرانی کتابوں کے اسٹال سے ہمارے ہاتھ لگی مقتدرہ قومی زبان کی کتاب ''ذہن ودماغ''؛ جسے دیکھ کر ہی دماغ گھوم گیا اور سر چکرانے لگا۔ جب پڑھنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ الہامی طرز کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، اس لیے وضو تو کر ہی لینا چاہیے۔ آپ بھی دیکھیے کہ میڈیکل کی کچھ اصطلاحات کو اسلامائزڈ کر دیا جاتا ہے تو وہ کس قدر مقدس مقدس سی محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً اعصابی مرسل، مرکز نظر شکیبہ، مکانی افعال، راس النخاع، شجرینے، مامونیات، مخروطی عصبانیہ، محوریہ وغیرہ وغیرہ۔ مقناطیسی گمکی عکس سے مراد Magnetic Resonance ہے اور خرد برقی مورچہ کسی جنگی محاذ کا نام نہیں بلکہ یہ Microelectrode کا مسلمانی نام ہے۔ برق پارہ Ions، سہارا دہند خلیے Glialcells، اعصابی مرسل Neurotransmitter، اکال خلیے Macrophages، غدّہ نخامیہ Pituitary Gland، عصبانیے Neurons، نیلی طباعت Blue Print، وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ کتاب گھریلو خواتین کے ہاتھ لگ جائے تو شاید کچھ تو اس سے استخارہ بھی نکالنا شروع کر دیں، جو بالکل درست بھی ثابت ہو۔ یہ جو کچھ علم وادب کے ساتھ ہمارے ہاں اہل علم وادب کر رہے ہیں، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پختہ ایمان اور صمیم قلب کے ساتھ کر رہے ہیں، اور ان کا ارادہ ہر صورت میں اردو کو کافروں کی زبانوں کی نجاست سے بچانا ہے، لیکن اس سلسلے میں وہ اردو میں جس طرز کی فارسی زبردستی ٹھونستے چلے جا رہے ہیں، یہ وہی طریقہ ہے کہ جس طرح ویگن کا کنڈکٹر ویگن میں مسافروں کو ٹھونستا ہے، اس طرز کی فارسی تو ابن انشا جب ایران گئے تھے تب ایران میں بولی نہیں جاتی تھی۔ حالانکہ وہ یہاں سے اچھی خاصی فارسی پیک کروا کے لے گئے تھے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ اس کا تو چلن ختم ہو گیا یا پھر شاید کبھی تھا ہی نہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے ہاں اسکولوں میں آٹھویں جماعت تک فارسی پڑھائی جاتی تھی، لیکن اب فارسی کے حوالے سے صرف

یونیورسٹیوں میں قائم شعبۂ فارسی سے ہی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پتہ نہیں یہاں جو فارسی پڑھائی جا رہی ہے وہ ایران کی فارسی سے مطابقت رکھتی بھی ہے یا نہیں؛ اس لیے کہ اگر یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے طلبا وطالبات ہوم ورک کا مترادف جدید فارسی میں دیکھیں تو یقیناً چونک جائیں، ممکن ہے قہقہہ بھی لگاتے ہوں؛ اس لیے کہ جدید فارسی زبان میں ہوم ورک کو تکلیف شب اوّل یا تکلیف شب دوئم کہتے ہیں۔ یہ عام سی بات ہے کہ پاس ہونے والا طالب علم خوش ہوتا ہے اور فیل ہونے والا مغموم.... لیکن اگر یہ طالب علم جدید فارسی سیکھ رہا ہو تو یہ کیفیات مزید دو چند ہو سکتی ہیں، اس لیے کہ فارسی زبان میں پاس ہونے کو قبول اور فیل ہونے کو مردود کہتے ہیں۔ جدید فارسی کے مزید دلچسپ لطائف؛ ایران میں اگر کوئی کف کہے تو قمیض یا آستین کا کف نہیں بلکہ جھاگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ فارسی میں گاہک کو مشتری کہتے ہیں، بحری جہاز کو کشتی، جب کہ بندرگاہ کو صرف بندر کہتے ہیں، اور شاید بندر کو کچھ نہیں کہتے ہوں، ان کے لیے فقط اتنا کہا جاتا ہو کہ اگر وہ گھر لوٹ آئیں تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جدید فارسی میں پارسل کو بستہ، عجائب گھر کو موزہ، کدال کو بیل، چیتے کو پلنگ، سینگ کو شاخ، برقعہ کو چادر، چیونٹی کو مورچہ اور چیونٹے کو مور کہتے ہیں۔ ایران میں اگر کوئی آپ سے درس کے بارے میں دریافت کرے تو آپ کھڑے کھڑے اسے اخلاقیات کا درس دینا نہ شروع کر دیں، دراصل وہ آپ سے درانتی طلب کر رہا ہے، فارسی میں درانتی کو درس کہتے ہیں۔ حضرت ضیاالحق کے فیض یافتہ ہمارے بعض اہل علم کو اگر جدید فارسی سیکھنا پڑ جائے تو ان کے لیے خاصا جاں سوز بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ فارسی میں اودبلاؤ کو سگ لاہور کہتے ہیں، پسو کو کیک، رسید کو قبض، ڈرافٹ کو برت، بغاوت کو قیام کہا جاتا ہے۔ جدید فارسی زبان میں کھٹمل کے لیے ساس کا لفظ مخصوص ہے، مینا کو شارک کہتے ہیں، مسافر کو غریب، نرس کو پرستار، وھیل مچھلی کو بال اور فٹبال کو توپ، قلی کو باربر اور دکاندار کو بازاری، جب کہ ہمارے ہاں اگر کسی دکاندار کو غلطی سے بازاری کہہ دیا جائے تو پھر شاید کہنے والا آئندہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہے۔ جدید فارسی میں عطر فروش کی صندوقچی کو طبلہ، کھرپی کو بیلچہ اور بیلچے کو بیل، کیمرے کو دوربین، کھڑکی کو پنجرا کہتے ہیں اور چالباز کو حقّہ باز کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ جدید فارسی میں سویّوں کے لیے لفظ رشتہ موجود ہے، لڑائی کے لیے دعویٰ، صاف کے لیے تمیز، پریشان کے لیے نگران، بندوق کے لیے تیتر، ریل گاڑی کے لیے قطار، پالیسی کے لیے رفتار اور ڈیپارٹمنٹ کے لیے بخشش کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کبھی ہمارے ضیاالحق زدہ لسانی ماہرین کا ایران جانا ہو اور ایران میں کوئی صاحب ان سے کہیں کہ وہ ان کو تکلیف دینا چاہتے ہیں تو وہ ناراض ہو جائیں گے، لیکن دراصل وہ ان موصوف کو کوئی کام یعنی Job پیشکش کر رہے ہوں گے، ہمیں یقین ہے کہ وہ کام یعنی JOB ضرور گورکن کی ہوگی، اس کام میں ہمارے بہت سے لسانی ماہرین کو شاید کوئی مشکل پیش نہ آئے کہ وہ برسوں سے اردو زبان کو زندہ درگور کرنے کا کام تو بہت خوبصورتی سے کر ہی رہے ہیں۔ ایران میں کسی صاحب کے لیے کہا جائے کہ وہ گرفتار ہیں تو بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ گرفتار کے جدید فارسی میں معنی ہیں معروف، اور کسی کے نام کے ساتھ دستگیر کا لفظ استعمال کیا جائے تو سمجھ جائیں کہ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہمارے بعض اہل علم وادب اردو زبان میں جس قسم کی فارسی انڈیل رہے ہیں، اسے دیکھ کر تو ہمیں کچھ

کچھ یقین سا ہونے لگا ہے کہ انھوں نے فارسی زبان ضرور اسی طرح سیکھی ہوگی جس طرح مغلیہ عہد کے ایک دیہات کے لوگوں نے سیکھی تھی۔ جب ہندوستان میں مغل بادشاہ بادشاہ کھیل رہے تھے تو اس دور میں ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی ہوا کرتی تھی اور ہندوستان کے عام شہری اس زبان سے بالکل نابلد تھے، یہ شاید برصغیر کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ سرکاری زبان وہ ہونی چاہیے جو یہاں کے عام باشندے سمجھ نہ سکیں، اگر آج ہمارے ملک کے 80 فیصد باشندے انگریزی سمجھنے لگیں گے تو پھر شاید سرکاری زبان ٹ کی بولی ہوگی، ف کی بولی تو ہم سب ہی ماشاءاللہ بچپن ہی میں سیکھ لیتے ہیں۔ ہم ذکر کر رہے تھے مغلیہ عہد کا اور تذکرہ آ گیا درمیان میں چغلیہ عہد کا، خیر عہد مغلیہ میں تمام دفتری و سرکاری معاملات فارسی زبان میں ہی نمٹائے جاتے تھے۔ ایک گاؤں کے لوگوں کو فارسی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا، گاؤں کے ایک سیانے نے انھیں سمجھایا کہ تمہارے نقصان کی وجہ دراصل یہ ہے کہ تم فارسی نہیں جانتے، چنانچہ سب نے مل کر فیصلہ کیا ان کے پاس فارسی ہونی چاہیے اور یوں وہ مشترکہ طور پر فارسی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ گاؤں سے باہر نکل کر یہ قافلہ ابھی کچھ دور ہی پہنچا ہوگا کہ ان لوگوں کو دو ٹھگ مل گئے، وہ دونوں کہیں سے دو مٹکے چرا کر لے جا رہے تھے، ان مٹکوں میں شہد کی مکھی کے چھتے مکھیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ موجود تھے، مٹکوں کا منہ کپڑے سے بند کیا ہوا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کو لاٹھیوں ڈنڈوں سے لیس، پیدل اور سوار ایک جانب جاتے دیکھا تو دونوں ٹھگوں نے ان سے معاملہ دریافت کیا، گاؤں والوں نے ان دونوں کو اپنی روداد سنائی تو ٹھگوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے اشارے کیے اور پھر گاؤں والوں سے بولے کہ یہ دونوں مٹکے فارسی سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ گاؤں والے تو نکلے ہی فارسی کی تلاش میں تھے، ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گاؤں کے باہر ہی فارسی انھیں مل جائے گی۔ وہ تو یہ سوچ کر نکلے تھے کہ نامعلوم کتنی مسافت طے کرنی پڑے اور کتنے مہینے کا سفر ہو، ان کی تو خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا، لہٰذا انھوں نے یہ فارسی بھرے مٹکے منہ مانگی قیمت پر خرید لیے۔ ٹھگوں نے گاؤں والوں کو بتایا کہ رات کے وقت گاؤں کے تمام مرد ایک بڑے کمرے میں جمع ہو جائیں اور کمرہ بند کر کے اپنے کپڑے اتار دیں پھر ان دونوں مٹکوں کا منہ کھول دیں، یوں گاؤں کے تمام مرد راتوں رات فارسی دان ہو جائیں گے۔ گاؤں والوں نے ٹھگوں کی ہدایت پر کما حقہ عمل کیا؛ نتیجہ کیا نکلا؟ ظاہر ہے گاؤں کے سارے مرد فارسی دان بن گئے، چاہے خود ان کے پاندان کہیں رکھنے کے لائق نہ رہے ہوں۔

> اپنی آواز کی بجائے اپنے دلائل کو بلند کیجیے۔
> پھول بادل کے گرجنے سے نہیں، برسنے سے اُگتے ہیں۔
> جلال الدین رومی

لال چیونٹیاں

صدیق عالم

''ایسا نہیں ہے کہ خدا کی ذات میں میرا یقین نہیں ہے۔ میں تو صرف بہت ہی احترام کے ساتھ ان کا دیا ہوا ٹکٹ انھیں واپس لوٹا رہا ہوں۔''
آئیوان کارامازوو (دوستوئفسکی کے ناول کا ایک کردار)

محرابوں والا دقیانوسی پل سنسان پڑا تھا۔ اس پر آخری ٹرین کو گذرے آدھا گھنٹہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ پل سے نصف فرلانگ دور ایک بوڑھا اپنی پیوند لگی چھتری اور اردو اخبار کے ساتھ، جسے وہ صبح سے شام تک پڑھا کرتا، ایک ٹیلے پر بیٹھا نیچے ڈھال کی طرف تاک رہا تھا جہاں اس کی بکریاں گھاس چر رہی تھیں۔ نیچے جہاں کھیت شروع ہو گئے تھے ایک ٹیلی گراف پول کے نیچے سوکھی جھاڑیوں سے گھرا ہوا منحنی سا پوکھر تھا، جس کے کنارے ایک نو سال کا بچہ سفید نیکر اور آدھی آستین والی عنابی رنگ کی ٹی شرٹ پہنے ایڑیوں کے بل بیٹھا مٹی پر کچھ کر رہا تھا۔ جاڑا ختم ہو رہا تھا مگر رات ہلکی بارش ہو جانے کے سبب ہوا میں خنکی آ گئی تھی جو دھوپ کی تمازت میں آرامدہ لگ رہی تھی۔ پوکھر میں بہت کم پانی رہ گیا تھا جس پر بچھے کنول کے پتوں پر پانی کے قطرے موتی کی طرح ڈول رہے تھے۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' بوڑھے نے چلا کر کہا۔ ''تمہاری بکریوں کو اچھی گھاس نہیں مل رہی ہے۔''

''میں چیونٹیوں کے ساتھ کھیل رہا ہوں دادا۔''

''کالی کہ لال؟''

''لال!''

بوڑھے نے آسمان پر نظر دوڑائی جس کے نیلے پن میں جگہ جگہ سفید دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، جیسے بادلوں کے کچھ تراشے وہاں رہ گئے ہوں۔ سورج مشرقی آسمان پر کافی اوپر آ گیا تھا اور اس طرح تمتما رہا تھا جیسے آج وہ زمین کے زیادہ سے زیادہ حصے پر اپنی روشنی پھیلانے پر بضد ہو۔ ''تم انھیں چھوٹی چیز سمجھنے کی

غلطی نہ کرو بچے...'' بوڑھے نے کہا۔ ''لال چیونٹیاں خطرناک ہوتی ہیں۔ یہ سارا علاقہ ان چیونٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔''

''میں انھیں سبق سکھانا چاہتا ہوں۔'' لڑکے نے جواب دیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مضبوط ٹانگوں سے چھلانگ لگاتا ہوا بوڑھے کے پاس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک چھوٹی شیشی تھی جس کے اندر اس نے چیونٹیاں جمع کر رکھی تھیں۔

''یہ تم نے کہاں سے سیکھا؟'' بوڑھے نے شیشی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا جو اندر کلبلاتی چیونٹیوں کے سبب سرخی مائل ہو گئی تھی۔ ''ہمارے وقت میں ہم اسے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔''

''میں نے سنا ہے، آپ لوگ بہت ظالم ہوا کرتے تھے۔'' لڑکے نے شیشی واپس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ لوگوں کے سبب ہے کہ اب تتلیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔''

بوڑھے نے ایک بار پھر آسمان پر نظر دوڑائی اور مسکرایا۔ ''لگ رہا ہے اب اسکولوں میں اچھی پڑھائی ہو رہی ہے۔ تم بکریوں کو سامنے چڑھائی پر کیوں نہیں لے جاتے جہاں کچنار کے پیڑ ہیں؟ وہاں دوسری طرف ڈھال پر تمھیں دوب نظر آئے گی۔ پھر تم ایک اچھے چرواہے نہیں بن سکتے۔''

''مجھے پرواہ نہیں، میں تو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔''

ہاں، اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے، بوڑھے نے سوچا۔ ہم بچوں کو ہمیشہ وہی چیزیں نہیں سکھا سکتے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہیں۔ بوڑھے نے بچے کے ہاتھ سے شیشی لے کر اس کے اندر کلبلاتی چیونٹیوں کی طرف غور سے دیکھا، گرچہ اس کی آنکھوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان چیونٹیوں کو انفرادی طور پر دیکھ سکے۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ معمولی چیونٹیاں نہیں ہیں۔ ایک بار ہم لوگوں نے اپنے بچپن میں مٹی کے ایک ڈھیر کو توڑا تھا جس کے اندر چیونٹیوں نے اپنی کالونی بسا رکھی تھی۔ اتنی ساری چیونٹیوں کو ایک ساتھ کلبلاتے دیکھ کر وہ لوگ حیران رہ گئے تھے۔ ان میں بہت ساروں کے پر بھی نکل آئے تھے۔ ''تم ان چیونٹیوں کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''یہ بکریاں نہیں کہ جدھر چاہے ہانک دو، جب چاہو گردن پر رسی ڈال دو یا سینگ سے پکڑ کر باڑے میں بند کر دو۔ انھیں قید رہنا پسند نہیں۔ تم انھیں ہمیشہ کے لیے روک نہیں سکتے۔''

بچہ بوڑھے کی چھڑی لے کر نشیب میں اتر چکا تھا۔ ''دادا، ڈھکن مت کھولنا، چیونٹیاں باہر نکل آئیں گی۔''

''تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟'' بوڑھا چلایا۔ دراصل اپنی لاعلمی میں وہ ٹن کا زنگ کھایا ہوا ڈھکن کھول چکا تھا اور دیکھتے دیکھتے چیونٹیاں اس کی انگلیوں پر نکل آئی تھیں۔ انگلیوں کو جھاڑتے ہوئے اس نے جلدی سے ڈھکن واپس لگا دیا۔ ''ایسا کیسے چل سکتا ہے۔ تم انھیں اس طرح قید نہیں کر سکتے۔ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے برخوردار؟''

بچے کو جواب میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بکریوں کو ہنکاتے ہوئے نیچے دھان کے کھیت میں اتر رہا تھا

جس کی فصل کاٹ لی گئی تھی اور اب ہر طرف پیال کے برش نما ٹھنٹھ پر بھنبیریاں منڈلا رہی تھیں۔ کھیت کی مٹی رات کی بارش کے سبب گیلی ہو رہی تھی۔ اس سے احتراز کرتے ہوئے وہ چڑھائی چڑھنے لگا جہاں کچنار کے پتے بچھے ہوئے تھے۔ اونٹ کے سموں کا 'آکار' لیے ہوئے یہ پتے بچے کو ہمیشہ حیران کر دیتے۔

بوڑھے نے مڑ کر نصف میل دور اپنے چھوٹے سے گاؤں پر نظر ڈالی جس کے زیادہ تر چھپر پھوس کے تھے مگر چند ٹن کی چھتیں بھی تھیں جو مورچہ کھا کر کتھئی رنگ کی ہو گئی تھیں۔ یہاں سے گھروں اور کھلیانوں کے باہر لگائی گئی کچیچ کی ٹٹریوں یا مٹی کی دیواروں کے آس پاس شاذ و نادر ہی کوئی جانور یا انسان دکھائی دے رہا تھا۔ اب لوگ گاؤں میں رہنا پسند نہیں کرتے، بوڑھے نے آہ بھر کر سوچا۔ میں اس گاؤں میں پیدا ہوا اور ساری زندگی اسی گاؤں میں رہا۔ ایک آدھ بار رشتہ داری یا شادی بیاہ کی خاطر دوسرے گاؤں جانا تو پڑا اور کئی بار علاج کے لیے یا ضروری سامان کی خریداری کے لیے شہر کا رخ بھی کرنا پڑا بلکہ ایک بار عدالت کے چکر میں بڑے شہر تک ہو آیا جس کے بڑے سے لوہے کے پل سے جتنے لوگ بقچہ اٹھائے باہر آ رہے تھے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگ اندر جا رہے تھے جیسے کوئی ان دیکھی طاقت انھیں اس جہنم میں دھکیل رہی ہو، مگر اس سے بڑا عجوبہ یہ تھا کہ وہاں بجلی کے تار کے نیچے لوہے کی پٹریوں پر چوکور کھڑکیوں والے ڈبے رینگ رہے تھے جن کے اندر لوگ بدھو کی طرح بیٹھے ہوئے تھے، جب کہ وہ پیدل زیادہ تیز جا سکتے تھے۔ بعد میں مجھے لوگوں نے بتایا کہ بجلی کے آنے سے پہلے ان ڈبوں کو گھوڑے کھینچتے تھے جیسے وہ اللہ کی مخلوق نہ ہو کر کوئی مشین ہوں، جس سے جو بھی کام چاہو لے سکتے ہو۔ مگر کل ملا کر دیکھا جائے تو اس گاؤں سے میں کبھی باہر نہیں گیا، اور مجھے نہیں لگتا اس سے میں نے کہیں کچھ کھویا ہے۔ مگر یہ بچے، ان کے دودھ کے دانت ٹھیک سے ٹوٹ بھی نہیں پاتے اور ان کے پر نکل آتے ہیں۔ اس نے شیشی کے اندر کلبلاتی چیونٹیوں کی طرف شرارت سے دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ لال چیونٹیاں نہ ہوں، سینکڑوں چھوٹے چھوٹے بچے ہوں ہو جن کے پر نکل آئے ہوں۔

بچے کو بکرے بکریاں پسند تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ہی کھیلتے ہوئے بڑا ہو رہا تھا۔ یہ اس وقت بھی خطرناک نہیں ہوتے جب ان کے سینگ نکل آتے ہیں۔ یہ جب آپس میں لڑتے ہیں تو ان کے سینگ یا سروں کے ٹکرانے میں کوئی وحشی پن نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک آدھ ٹکر لگا کر وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ سینگ مضبوطی سے اپنی جگہ قائم ہیں یا نہیں۔ بڑے بڑوں کی دیکھا دیکھی میمنے بھی ان کی نقل کرنے سے باز نہیں آتے۔ اسے ان میمنوں کی منحنی دُمیں پسند تھیں جو ہر وقت ہلتی رہتیں، جنھیں آپ ہزار کوشش کے باوجود پکڑ نہیں سکتے۔ اور بکریاں، وہ جب چلّاتی ہیں تو دور تک کتنے سکون کا احساس ہوتا ہے۔ یہ چلّانا ان کتوں کے بھونکنے سے کتنا مختلف ہوتا ہے جو اچانک سنّاٹے کو چونکا دیتے ہیں۔ اگر میرا ڈامنا مر نہ گیا ہوتا تو میں اسے ان بکریوں کی تہذیب سکھاتا۔ اسے یاد نہیں تھا، اس کا اور ڈامنا کا ساتھ کب شروع ہوا۔ گاؤں کی زندگی میں کوئی چیز باہر سے نہیں آتی، نہ کسی چیز کی شروعات ہوتی ہے۔ سب کچھ یہاں کے ماحول میں موجود ہوتا ہے، ہمیشہ سے موجود ہوتا ہے، اس کے اپنے گاؤں کی طرح جو ہمیشہ سے موجود ہے، اس آسمان کے نیچے جو اس کی پیدائش کے پہلے دن سے موجود ہے اور اس کی موت کے بعد بھی موجود رہے گا چاہے وہ کہیں بھی رہے اور

کہیں بھی چلا جائے، یا اس تالاب کی طرح جس کی عمر کوئی نہیں جانتا یا درختوں کے جھنڈ کی طرح جو ڈھلانوں پر ایک ہی انداز سے کھڑے بادلوں کا انتظار کرتے ہیں، بادل جو زیادہ تر انھیں نظر انداز کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں یا زمین سے لہروں کے مانند نکلی ہوئی ان عفریتی چٹانوں کی طرح جن کی کسی نوکیلی چوٹی سے کبھی کبھار کسی مہم جو میمنے کو اتارتے وقت اچھا خاصہ ہنگامہ مچ جاتا ہے۔ ڈامنا، وہ بڑا ہی کمینہ کتا تھا جسے چھوٹے چھوٹے جانوروں میں دہشت پھیلا نا پسند تھا۔ ڈامنا نے کبھی کسی کو کاٹا نہیں تھا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کسی کو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ دراصل اس گاؤں میں کاٹنے کے لیے اوسطاً لوگ کم تھے یا پھر یوں ہے کہ گاؤں والوں کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ وہ کتوں سے کٹوانے کا خطرہ مول لیتے۔ اس کے گاؤں میں ڈامنا واحد کتا نہ تھا، مگر یہ ڈامنا بھی عجیب تھا۔ اس نے پچھلے سال اچانک ایک دن چپ رہنے کی عادت ڈال لی اور کھانا پینا بند کر دیا۔ اس واقعے کو کچھ ہی دن گذر پائے تھے کہ ایک صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنی دُم کے گرد چکر لگا رہا تھا جیسے کسی نے اس کی مقعد پر پٹرول ڈال دیا ہو۔ وہ بلا وجہ بھونکنے اور غرانے بھی لگا تھا۔ اس نے ڈھلان کی طرف بھاگنے کی عادت ڈال لی جہاں سے اسے لانے کے لیے اچھی خاصی محنت کرنی پڑتی۔ ''اس نے کوئی سایہ دیکھ لیا ہوگا۔'' بوڑھے نے بچے کو تاکید کی۔ ''اس سے دور رہنا۔ وہ پہلے بھی کوئی اچھا کتا نہ تھا۔'' بچے کو دادا کی بات سے تکلیف پہنچی تھی۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ ایک جانور تھا؟ اگر وہ بیمار ہے تو اس کا علاج کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ بوڑھے کو اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی تھی۔ ''تم ان کتوں کا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ اگر مرنے کی ٹھان لیں تو تم انھیں روک نہیں سکتے۔ لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہر بار ایک دوسرا کتا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ ان جانوروں کی پرانی عادت ہے۔'' ڈامنا کو مرے ہوئے ایک برس ہو چکا تھا، مگر کسی دوسرے کتے نے اس کی جگہ نہیں لی تھی، گرچہ گاؤں میں کتوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اسے ڈامنا کی موت پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ ایک شام ڈھلان سے گھر واپس نہیں لوٹا اور چار دن بعد دو کوس دور جنگل کے اندر مردہ پایا گیا۔ اس کے سارے جسم پر زخم کے نشان تھے، دیدے پھٹے ہوئے تھے، پپوٹوں اور نتھنوں پر پسو بیٹھے ہوئے تھے اور زخموں پر بھاری تعداد میں مکھیاں بھنبنا رہی تھیں۔ (بعد میں اسے پتہ چلا تھا کہ اس نے دور کے کسی آدیباسی گاؤں میں کافی تباہی مچائی تھی، ایک گھر میں گھس کر نہ صرف ایک عورت کو کاٹنے کے بعد اسکول کے میدان میں چار بچوں کے منہ اور پاؤں میں کاٹ لیا تھا بلکہ دو بکریوں اور ایک کتے کو بھی کاٹا تھا۔ آدیباسیوں کو جب اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے لاٹھی ڈنڈوں سے اس کی خوب ٹھکائی کی اور اسے جان بچا کر جنگل کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا جہاں زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے دم توڑ دیا تھا۔) یہ ہوا میں تیرتی اس کے جسم کی باس تھی جس کے سبب اسے ڈھونڈ نا ممکن ہو سکا۔ چھوٹے چاچا نے جواب اسی طرح کے کاموں کے لیے ہی رہ گئے تھے، اسے ڈھونڈنے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ شاید ڈامنا کے زخموں میں زہر پھیل چکا تھا، کیونکہ چیل اور کوے اس سے کچھ دور کھڑے چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہے تھے بلکہ ایک بوڑھا گدھ جس کی گردن پر ایک بھی بال نہ تھا، ایک قریب کی چٹان پر بیٹھا تذبذب سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ دونوں ناک پر کپڑا دبائے گھر واپس لوٹ آئے۔ شاید یہی وہ موت ہے جسے بڑے بوڑھے کتے کی موت کہتے ہیں۔ بچہ ایک جھاڑی کے

سائے میں ہری دوب پر بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ بکریوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت ہی ٹھگنا درخت اپنے پھپھوندی سے ڈھکے ہوئے تنے کے ساتھ کھڑا تھا جیسے اسے فیل پا کی بیماری ہو گئی ہو۔ اس کی خشک ٹہنیوں پر حیرت انگیز طور پر نئے نئے مدور پتے نکل آئے تھے۔ درخت کے کھردرے تنے پر لال بیگ رینگ رہے تھے اور چیونٹیاں چکردار سیڑھی کی شکل میں درخت کے تنے پر چل رہی تھیں جن کا ایک قافلہ اوپر کی طرف جا رہا تھا، جبکہ دوسرا نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے اترتی چیونٹیوں نے کافی بڑی جسامت کی ہری ہری پتیاں بادبان کی شکل میں اوپر اٹھا رکھی تھیں جن کے بوجھ سے وہ ڈگمگاتے ہوئے چل رہی تھیں۔ دادا ٹھیک کہتے ہیں، یہ سارا علاقہ چیونٹیوں سے بھرا پڑا ہے، مگر جانے چیونٹیاں ان پتیوں کا کیا کرتی ہوں گی؟ شاید ان بے ضرر لال بیگ کی طرح انھیں بھی پتوں کا رس مرغوب ہو۔ یہ چیونٹیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ یہ مردہ جڑوں سے لے کر مردہ کیڑوں مکوڑوں تک کو نہیں چھوڑتیں۔ ان کی اچھی خاصی تعداد یہاں سے سات فرلانگ دور برساتی نالے کے کنارے دیکھی جا سکتی تھی جو نالا کہلاتا تو تھا مگر سال کے نو مہینے سوکھا پڑا رہتا یا اس میں پانی برائے نام رہتا۔ اس نالے کے کنارے کوڑھیوں کی بستی تھی، جہاں کے درخت ان جذام کے مریضوں کی طرح ہی مرگھلے تھے اور ہر دوسرے یا تیسرے پیڑ پر دم کوڑوں کا غلبہ تھا۔ موسم کوئی بھی ہو، ان کے تنوں سے لاسے رستے رہتے۔ ڈامنا کی تلاش میں وہ ایک بار اس نالے کے اوپر جا نکلا تھا۔ نالا کافی نیچے واقع تھا۔ وہ جس چٹان پر کھڑا تھا وہ نالے پر کسی چونچ کی طرح نکلی ہوئی تھی جہاں سے نیچے نالے کے پانی کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نالے میں پانی سے زیادہ پتھر اور چٹانیں تھیں۔ نالا کے دوسرے کنارے پر کوڑھیوں کے گھاس پھوس کے چھپر تھے جن کی مٹی کی دیواروں سے ہانڈیاں اور بانس کے ٹوکرے لٹک رہے ہوتے۔ ایک ٹن کا گھر بھی تھا جس کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس چمنی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کسی متروک ریلوے کوارٹر کی چھت سے اکھاڑ کر اس جگہ لگا دیا گیا تھا۔ شاید وہ کسی قسم کا پنچایتی کچن ہو۔ مٹی کی دیواروں پر کھریا مٹی اور چونے سے پھول بنائے گئے تھے۔ ہر جھونپڑے کے باہر اوکھ کی چٹائیوں سے گھرے سبزی کے کھیت تھے۔ ایک گھر سے لگے ہوئے ڈربے کے باہر ایک چینی مرغی کھڑی اپنے پنجوں سے زمین کو کھرچ کھرچ کر چوزوں کو دانہ چگنے کی تعلیم دے رہی تھی، جب کہ ایک دوسرے گھر کے باہر سور کی ایک لحیم شحیم مادہ دیوار سے گتھی ہوئی ناند کے اندر اپنی تھوتھنی ڈالے پیروں سے اپنے انگنت بچوں کو دھکیلتی جا رہی تھی جو اس کے بڑے سے بے شمار گھنڈیوں والے تھن میں گھسے جا رہے تھے۔ وہ دیر تک نالے کے اوپر کھڑا نیچے کوڑھیوں کی بستی کی طرف دیکھتا رہا، مگر کل ملا کر اسے جذام کا صرف ایک ہی مریض دکھائی دیا جس کے پیچھے ایک کتے کا پلا چل رہا تھا، جیسے وہ اس کے سائے کے ساتھ گھسٹ رہا ہو۔ وہ شاید کوئی عورت تھی جس نے لنگی پہن رکھی تھی۔ پیروں کی ساری انگلیاں گل جانے کے سبب وہ مشکل سے چل پا رہی تھی، مگر فاصلہ کچھ کم ہونے پر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا چہرا تو کسی مرد سے ملتا جلتا تھا۔ اس نے پرانے ٹائر کی بڑی جسامت کی چپلیں پہن رکھی تھیں جنھیں بچے نے اپنے گاؤں میں آنے والے زیادہ تر بھکاریوں کو پہنتے دیکھا تھا۔ کوڑھی نے بچے کو دیکھ لیا۔ اس کی ناک کی جگہ ایک سوراخ تھا اور اس کی آنکھوں پر تار کے حلقوں میں پھنسی کانچ کی دو تاریک ٹکیاں تھیں جنھیں اس نے ڈنڈیوں

کی غیر موجودگی میں سُتلی کی مدد سے سر کی پشت سے باندھ رکھی تھیں۔ شاید اسے دھوپ سے پریشانی ہوتی ہو۔ وہ اپنے پوپلے منہ سے عجیب انداز سے ہنس رہا تھا یا ہنس رہی تھی۔ ڈامنا اس گاؤں میں کبھی نہیں ہوسکتا، بچے نے فیصلہ کیا اور واپس لوٹ آیا۔ اس نے جب دادا سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے اپنے مضبوط دانتوں سے ہنستے ہوئے اس کا سر سہلایا۔ ''وہاں پر ہر گاؤں کے نمائندے تمھیں نظر آئیں گے۔ ان میں کافی پڑھے لکھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ تھوڑا قریب جانے پر تم انھیں پہچان سکتے تھے۔ کوڑھیوں کے ہسپتال سے نکلنے کے بعد انھیں اپنے لوگ قبول نہیں کرتے، اس لیے وہ انسانی آبادی سے الگ تھلگ اپنی کالونی بسا لیتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ نالے کے پانی سے سبزی اگاتے ہیں اور عبادت گاہوں کے باہر یا اسٹیشنوں میں بھیک مانگتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے بارے میں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہوسکتا ہے ان کے لوگ پیسے بھیجتے ہوں۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں، ان کی انگلیاں تو ہوتی نہیں، جانے وہ منی آرڈر پر کیسے دستخط کرتے ہوں گے! ان کے چہرے پھول کر کپّا ہو جانے کے سبب کبھی کبھی پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ تم کسی مرد کو دیکھ رہے ہو یا عورت کو۔ اور وہ زیادہ تر تمھیں پوپلے نظر آئیں گے، کیونکہ ان کے جبڑے فساد خون کے سبب پہلے تو غبارے کی طرح پھول جاتے ہیں اور پھر سکڑنے لگتے ہیں جو دانتوں کو سنبھال نہیں پاتے۔'' اسے دادا پر حیرت ہوتی۔ انھیں ہر بات کا کیسے پتہ ہوتا ہے؟ شاید ان کا اخبار، جسے وہ ہر روز بلا ناغہ صبح سے شام تک پڑھا کرتے ہیں یا پھر آسمان یہ سب کچھ دادا کو بتاتا ہے۔ اس نے اکثر دادا کو آسمان سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دادا کی باتیں غور سے سنا کرتا اور ان کے نامانوس لفظوں کو ان کے مبہم مفاہیم کے ساتھ ذہن نشیں کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک بار جب دادا ڈاکیہ سے منی آرڈر کی رقم وصول کر رہے تھے، جسے بچے کا باپ شہر سے بھیجا کرتا جہاں وہ ایک سرکاری بینک میں ملازم تھا، تو انھوں نے ڈاکیہ کی سائیکل کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ''میں نے ایک انگریز گارڈ کو دیکھا تھا جو اسی طرح کی ایک سائیکل اپنی ٹرین کے کیبن میں رکھا کرتا۔ وہ اپنی سائیکل کی بڑی حفاظت کرتا تھا۔ اسے گاؤں کے راستوں پر سائیکل چلانا پسند تھا۔'' ''پھر تو وہ بالکل پاگل تھا۔'' ڈاکیہ نے کہا۔ ''کوئی بلا وجہ بھی سائیکل چلاتا ہے بھلا۔'' ''ہمیں ہر وہ چیز پاگل دکھائی دیتی ہے جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔'' ڈاکیہ کے جانے کے بعد دادا نے روپیوں کو دوبارا گنتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے نوٹ پر بنی آدمی کی تصویر پر اپنی انگلی رکھ کر بچے کی توجہ اس کی طرف مبذول کی۔ ''اس تصویر کو دیکھ رہے ہو، آدمی اپنی تصویر میں کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، نہ ہی وہ مرتا ہے۔ لیکن کیا وہ اپنی تصویر میں بھی اتنا ہی عقلمند یا بے وقوف ہوتا ہے، مجھے یہ نہیں پتہ۔''

اگلے برس جب مجھے بڑے اسکول میں داخلہ ملے گا جو چار کوس دور ہے تو ابو نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ایک سائیکل دلا دیں گے۔ بڑے چاچا کی سائیکل کی طرح زنگ کھائی ہوئی مریل سائیکل نہیں، جس کی چین ہر دس منٹ پر اتر جاتی ہے، بلکہ ایک مضبوط اور بالکل نئی سائیکل۔ ممکن ہے وہ اس انگریز گارڈ کی سائیکل نکل آئے یا اس جیسا کچھ اور میں وعدہ کرتا ہوں میں اس سائیکل کا پورا خیال رکھوں گا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک سفید فام کو دیکھنے لگا جو ایک چمکدار سائیکل پر چلا جا رہا

تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے سر پر تنکے کا ایک ہیٹ چڑھا رکھا تھا اور اس کے تاریک اور مخروطی ہونٹوں کے بیچ ایک بیڑی سلگ رہی تھی۔ اس نے دادا اور ڈاکیہ کو بھی دیکھا، جو ایک اونچی جگہ پر کھڑے اس انگریز گارڈ کو حیرت سے دیکھ رہے تھے، جیسے اس سے پہلے انھوں نے کسی احمق کو نہ دیکھا ہو۔

☆

گاؤں کی مسجد کے کھپریلوں کو کوؤں نے تہس نہس کر رکھا تھا۔ اس کے مٹی کے برآمدے پر قطار سے سجے ہوئے پلاسٹک کے رنگین لوٹوں میں وضو کے بعد جان بوجھ کر تھوڑا پانی چھوڑ دیا جاتا، تاکہ وہ ہوا سے الٹ نہ جائیں اور ہر اذان کے بعد اس کا پیش امام جو اس کا مؤذن بھی تھا، ہمیشہ سوچا کرتا کہ میں یہاں بھٹک کر کیسے آ گیا اور ایسا کیا ہے یہاں میرے رکنے کے لیے کہ میں رک گیا، جب کہ یہاں میرے پیٹ بھر کھانے کا انتظام تک نہیں؟ مسجد کے پیچھے جہاں وہ تالاب کے پانی کی مدد سے ٹماٹر اگایا کرتا، بچے کلام پاک پڑھنے آتے، جن سے ہر ہفتے اسے ایک اٹھنی کی امید ہوتی۔ فاتحہ اور جھاڑ پھونک سے وہ بس اتنا بھر نکال پاتا کہ گھر کچھ رقم بھیج سکے، جس کے لیے ڈھال میں ڈاک خانے کی طرف اسے دو کوس کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا۔ جب وہ بہت پریشان ہو جاتا تو بڑے کافرانہ انداز میں سوچتا، خدا کو ہم جیسوں کے لیے فرصت نہیں ہے اور اس بوڑھے کو اپنے پوتے اور بکرے بکریوں سے کبھی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ نماز کے لیے مسجد آوے۔ میرا بس چلتا تو میں اس کے لیے کوڑوں کی سزا تجویز کرتا، اور اس بچے کو میں چھوٹے سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنے دادا کی طرح ہی سر پھرا ہے۔ یہ سارا گاؤں ہی سر پھرا ہے۔ خدا کو اگر مجھے یہاں بھیجنا تھا تو اس کی کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ مجھے ایسی کوئی مصلحت دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ شاید خدا کے پاس میرے لیے فرصت نہیں ہے۔ اب تو لوگ جھاڑ پھونک کے لئے بھی کتنا کم آنے لگے ہیں۔ کیا سارے بھوت پریت نیست نابود ہو گئے؟ اسے عمل برائے نام آتا تھا ورنہ وہ جنوں کو بلا کر اس گاؤں پر نازل کرتا، مگر آدھی رات کو چھپر پر کھٹ پٹ سن کر اس کی نیند کھل جاتی تو مارے خوف کے اس کی گھگھی بندھ جاتی۔ وہ دفع بلیات کی ساری سورتیں بھول جاتا۔ پھر ایک رات جب اس نے مسجد کے صحن پر سفید چادر سے لپٹی ایک عورت کو دیکھا جو بال بکھرائے بیٹھی اپنی خونیں آنکھوں سے اس کی طرف تاک رہی تھی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے سورۂ اخلاص پڑھ کر اپنے گرد حصار کھینچنے کی کوشش کی، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اس سورہ کو سرے سے بھول چکا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں اس کے پیشاب خطا ہو گئی اور اس نے دیکھا وہ عورت اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔ اس صبح جب مسجد کی طرف سے اذان کی آواز نہیں آئی تو تفتیش کے لئے کئی کٹر نمازی منھ اندھیرے مسجد کی طرف آئے۔ انھوں نے دیکھا امام تالاب کے پتھر پر جانگھیا پہنے بیٹھا تھا اور سر پر لوٹے سے پانی انڈیل رہا تھا، اس کے دانت ٹھنڈ سے بج رہے تھے۔ دوسرے دن سے وہ نماز عشا کے بعد مسجد کے کواڑ پر قفل لٹکا کر گاؤں کے ایک گھر میں سونے لگا۔ بوڑھے نے پیش امام کو ہمیشہ ایک بے وقوف کی طرح دیکھا تھا جس کے سر پر قاعدے کی ہڈیاں تک نہ تھیں کہ ٹوپی ٹھیک طرح سے جمی رہ سکے۔ ایسا فاقہ کش انسان

میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہے۔ بوڑھے کو جمعہ یا جنازہ کی نماز، نیز عید بقرعید کے علاوہ کبھی گاؤں والوں نے مسجد جاتے نہیں دیکھا تھا، مگر اس سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ گاؤں کی تاریخ میں ہمیشہ ایسے بوڑھے موجود رہتے ہیں۔ گاؤں میں کچھ ایسے بوڑھے تھے جن کی بینائی جا چکی تھی مگر جنھیں ایک جگہ بیٹھے رہنے سے خدا واسطے کا بیر تھا اور وہ ٹٹولتے ہوئے ہمیشہ غلط جگہ پہنچ جایا کرتے، جہاں سے انھیں واپس لانے میں اچھا خاصہ وقت لگ جاتا۔ ایسے بوڑھے بھی تھے جو اونچا سننے لگے تھے مگر وہ لوگوں سے دنیا جہان کی خبریں سننے کے لیے بے تاب نظر آتے اور ایسے بھی کئی بوڑھے تھے جو اپنا کھایا ہوا کھانا ہضم نہ کر پانے کے سبب پریشان پھرا کرتے اور ہمیشہ تالاب کے کنارے کی ملائم مٹی کو اپنی لاٹھی کی نوک سے ٹٹولتے نظر آتے، اور جو صحت مند تھے ان سے کسی طرح کی امید فضول تھی۔ کل ملا کر دیکھا جائے تو سارے بوڑھے ایک جیسے تھے، جیسے اپنی قبر کا راستہ بھول گئے ہوں۔

اگلے سو برس تک یہ دنیا بدلنے والی نہیں، پیش امام کچے راستے کے کنارے کھڑا گاؤں کی واحد چائے کی دکان کے بارے میں سوچ رہا تھا، جہاں اس کا ادھار چلتا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں، اس آسمان میں اب تارے بھی نہیں ٹوٹتے اور دور تک کتنی کانٹے دار جھاڑیوں اور اونٹ کٹاروں سے ڈھکی زمینیں ہیں، اور یہ لاغر پیڑ اتنی بنجر مٹی پر پانی کے بغیر کیسے زندہ رہ لیتے ہیں۔ یہ زمین تو خاص طور پر فاقہ کشوں کے لیے بنائی گئی ہے۔

دراصل اس میں قصور اس کا نہ تھا۔ ہم جس طرح کی زندگی گذارتے ہیں، دنیا ہمیں ویسی ہی نظر آتی ہے۔ (راوی)

دراصل پانی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پودوں کو اُگنے یا انسانوں کو مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ (بوڑھا)

دراصل یہ بکریاں بڑی سخت جان ہوتی ہیں۔ جب پتوں کا موسم نہیں ہوتا تب بھی یہ نہیں مرتیں، بس دم ہلاتی رہتی ہیں۔ (بچہ)

اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ پیش امام نے گاؤں والوں کو ایک جگہ جمع کر کے حکم صادر فرمایا کہ اسے بھر پیٹ کھانا کھلایا جائے اور اسے ایک گائے کی ضرورت ہے جو اس کے لیے دودھ دے سکے اور چند بطخ تا کہ تالاب کے جس پانی سے وہ ٹماٹر اگاتا ہے، وہ اس میں تیر سکیں اور خدا نے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ جس قوم کے عالم فاقہ کرتے ہیں اس قوم کا علم مر جاتا ہے۔ گاؤں والے پیش امام کو پسند کرتے تھے، انھوں نے سوچا اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ دن گذرتے رہے اور پیش امام خود اپنی مانگوں کو بھول گیا، لیکن ایک دن چھپر پر بیٹھے کوؤں نے دیکھا کہ اس کے پاس تین بطخ تھے۔ اس کے ایک ماہ کے بعد وہ ڈھال پر ایک مریل گائے کی گردن پر رسی ڈالے آتا نظر آیا۔ لوگوں پر یہ بھی کھلا کہ گاؤں کے چھپروں پر سائے کھسر پھسر کرنے لگے ہیں اور ٹن کی چھتوں پر دھما چوکڑی ہونے لگی ہے۔ انھوں نے پیش امام سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ان کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔ اس نے صرف اتنا کہا ''یہ ڈر ثابت کرتا ہے کہ خدا کی ذات میں تم لوگوں کا یقین پختہ ہے۔'' اس سال جاڑے کے آخر میں پیش امام نے کئی کافی بڑی جسامت کے ٹماٹر اگائے۔

''سائنس!'' پیش امام ہنسا۔ لوگوں نے جب اس کی بطخوں کو انڈا دیتے دیکھا تو انڈوں کی جسامت دیکھ کر ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ''سائنس!'' پیش امام پھر ہنسا۔ اپنی گائے کے لیے پیش امام نے ایک چرواہے کو رشوت دی، جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ گائے کو زبردست حمل آیا اور وہ دو بچھڑوں کی ماں بن گئی۔ اب پیش امام کے پاس ضرورت سے زیادہ دودھ تھا جس کا بڑا حصہ وہ بیچ دیا کرتا۔ وہ جب اپنا جھاگ سے بھرا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگاتا تو آنکھوں کو نچا کر کہتا: ''سائنس!'' لیکن بہت جلد اسے پتہ چل گیا کہ ان تمام چیزوں کے باوجود وہ ویسا ہی تھا؛ فاقہ کش، مفلس اور ایک بے حس زمین پر زندہ، جو چاروں طرف سے بنجر ڈھلانوں سے گھری ہوئی تھی۔ تو اس نے سوچا اسے کاروبار کرنا چاہیے۔ اس نے کچھ رقم ادھار لی اور کپڑوں کا بیوپار شروع کر دیا۔ وہ دن کے وقت گٹھر پیٹھ پر لاد کر ہفتہ وار ہاٹ یا میلوں کی طرف نکل جاتا اور ظہر کی نماز سے قبل لوٹ آتا۔ کسی کسی دن صبح سویرے وہ ریلوے اسٹیشن کی راہ لیتا، یا بس میں بیٹھ کر دور دراز کے قصبوں کا رخ کرتا۔ ایک بار وہ واپس لوٹا تو اس کے ساتھ ایک بائیسکوپ والا تھا۔ اس کے بال لانبے تھے، جسے اس نے چوٹی کی شکل میں باندھ کر پشت پر لٹکا رکھی تھی اور بات کرتے وقت اس کی کنٹھ کی ہڈی ہمیشہ گرتی رہتی۔ ''یہ چودھری گُر نارائن ہے۔'' امام صاحب نے کہا۔ ''اس نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب اس کا نام شیخ سلامت علی ہے۔''

شیخ سلامت علی کو اپنے ماضی کے بارے میں بات کرنا پسند نہ تھا جسے وہ دور جہالت سے تعبیر کرتا۔ اس کا بائیسکوپ جسے وہ اپنی لکڑی کی قینچی نما اسٹینڈ پر رکھ کر اس کے سامنے کھڑا اپنی لمبی چوٹی سے کھیلتے ہوئے، جس میں اس کی منحنی کنگھی پھنسی ہوتی، پان کی جگالی کیا کرتا۔ بائیسکوپ کی دیوار پر جگہ جگہ فلمی ہیرو ہیروئن کی تصویروں کو حال ہی میں اکھاڑ کر ان کی جگہ مکہ مدینہ کی تصویریں چپکا دی گئی تھیں۔ اس کے سیر بین سوراخوں کے گرد قدیم زمانے کے بے شمار سکے کیل سے جڑے ہوئے تھے، جن میں زیادہ تر اب رائج نہ تھے جو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ یہ بائیسکوپ کئی پشتوں سے اس کے ساتھ تھا۔ بائیسکوپ ہر طرح کے پھندنوں اور لڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور جب وہ اندر کے مناظر بدلنے کے لیے اس کی دونوں چرخیوں میں سے کسی ایک کو گھماتا تو گھنٹی بجاتے ہوئے یہ بھی بتاتا جاتا کہ اندر کون سا منظر چل رہا ہے۔ دادا کے ساتھ کھڑے بچے کو بڑی حیرت ہوتی کہ کس طرح وہ بنا دیکھے اندر کی ساری باتیں بتا دیا کرتا تھا۔ بوڑھا اپنی دائمی ہنسی ہنستا۔ ''یہ بائیسکوپ والا پچھلے سو سال سے آ رہا ہے۔ یہ ہر بار وہی بائیسکوپ والا ہے۔''

''اگر بڑھئو کو اتنا پتہ ہے تو وہ اس گاؤں میں کیا کر رہا ہے؟'' پیش امام کو اس کی بات پسند نہ آتی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس بات کے مقابلے کہ اس نے ایک کافر کو ایمان کا راستہ دکھایا تھا، اس کی اہمیت زیادہ ہو گئی تھی کہ وہ ایک بائیسکوپ والا تھا۔ جمعہ کے خطبے میں اس نے خاص طور پر شیخ سلامت علی کا ذکر کیا، ''جب کوئی اندھیرے سے اچانک اجالے میں آتا ہے تو اس کی آنکھیں چکا چوندھ ہو جاتی ہیں،'' پیش امام نے کہا۔ ''شیخ سلامت علی کے سلسلے میں ہمیں اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔ سلامت علی تم کیا محسوس کر رہے ہو؟''

''حضور امام صاحب، اللہ پاک اور رسول پاک اور لا الٰہ الاّ اللہ محمد رّسول اللہ۔''

''مرحبا! مرحبا!'' نمازیوں نے بیک وقت آواز بلند کی اور چھپر پر بیٹھے ایک کوے نے ایک کھپریل کو اپنے پنجے سے ہٹا کر نیچے دیکھا تو اسے مسجد میں اور دنوں کے مقابلے زیادہ نمازی نظر آئے۔ کھپریل کے ہٹنے سے دھوپ کا جو نیزہ اندر داخل ہوا تھا، اس سے بیزار ہوکر ہشت پا مکڑی نے جالا بنتے بنتے کوے کی طرف ناخوشگواری سے دیکھا اور اس پر تھوکنے کی کوشش کی، جو تار بن کر ہوا میں لٹک گئی۔

''دراصل...'' پیش امام نے تائید میں سر ہلایا۔ ''یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ روز حشر ہر کسی کو اس کے اعمال کے ساتھ تولا جائے گا۔ وہ جنھوں نے نماز قائم کی اور قبلہ درست کیا، وہ بخیر و خوبی پُل صراط سے گذر جائیں گے، مگر جنھوں نے خدا کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر دنیا کی پیروی کی، وہ پُل صراط سے دو نیم ہوکر دوزخ میں جا گریں گے، جہاں انھیں گندھک کا لباس اور کھجلی کا دوپٹہ پہنایا جائے گا اور ان کے مال و اسباب ان کے ایندھن ہوں گے۔ حضرات درود شریف پڑھیے اور شیخ سلامت علی سے معانقہ کیجیے۔''

شیخ سلامت علی ایک ہفتہ گاؤں میں رہا۔ اس نے بچوں کو بائیسکوپ کے بارے میں بتایا تو پہلی بار لاشعوری طور پر اپنے ماضی کا ذکر چھیڑ بیٹھا، ''یہ بائیسکوپ پہلی بار لاٹ بہادر نے ولایت سے منگوایا تھا۔ ان دنوں لاٹ بہادر کا دماغ کب کس طرف چل پڑتا، کسی کو پتہ نہ تھا۔ اسے میرے دادا چلاتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے اونٹ کو کم چارہ کھلایا، جس سے اونٹ کو سخت غصہ آ گیا۔ دوسری صبح وہ اسے باہر نکال رہے تھے کہ اونٹ نے ان کے سر کو اپنے جبڑوں میں لے کر توڑ ڈالا۔ اونٹ بڑا ہی خناس جانور ہے۔ جب تک سب کچھ ٹھیک ہے تو ٹھیک ہے، مگر بھگوان نہ کرے کہ اسے طیش آ جائے۔ میری دادی اب بھی زندہ ہے مگر اب اس کے منھ میں صرف ایک دانت بچا ہے اور اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا، یہاں تک کہ وہ یہ بھی بھول جاتی ہے کہ اسے پاخانہ جانا ہے۔ لمبی زندگی بھی ایک بڑی مصیبت ہے، اوپر والا کسی کو لمبی زندگی نہ دے۔ اب یہ بکس میری تحویل میں ہے۔ وہ بڑا بدنصیب ہوتا ہے جو اسے وراثت میں پاتا ہے۔ اسے چلانا آسان کام نہیں۔ اس کے ساتھ ہی تمھیں دنیا میں پیدا ہونا پڑا ہے۔''

شیخ سلامت علی کے ایمان لانے کے واقعے نے امام صاحب کی شہرت چار دانگ پھیلا دی اور بہت جلد اسے شہر کی ایک مسجد میں باقاعدہ ماہانہ تنخواہ کے ساتھ پیش امامی کی نوکری مل گئی۔ وہاں نہ صرف مسجد میں اذان کے لیے الگ سے ایک مؤذن مقرر تھا، بلکہ امام صاحب کو رہنے کے لیے ایک حجرہ بھی پیش کیا گیا جہاں وہ ذاتی آمدنی کے لیے اپنا مدرسہ چلا سکتا تھا۔ کچھ دنوں تک گاؤں کی مسجد میں گاؤں کا ہی ایک آدمی نماز پڑھاتا رہا، مگر اسے صحیح زبان نہیں آتی تھی اور علم تجوید سے نابلد ہونے کے سبب وہ حروف کی ادائیگی صحیح مخرج کے ساتھ کر نہیں پاتا تھا۔ اس کی یادداشت بھی کمزور تھی، اکثر وہ نماز کے دوران سورہ سے بھٹک جاتا، نمازیوں میں سے کسی کے اندر صلاحیت نہ تھی کہ اس کی تصحیح کرتا اور جب وہ پڑھتے پڑھتے رک جاتا تو ایسا کوئی نہ تھا جو اسے لقمہ دیتا۔ نتیجتاً وہ لوگ دیر تک کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ نمازی خوف سے کانپا کرتے کہ کہیں محض اس لیے وہ جہنم نہ پہنچ جائیں کہ انھوں نے نماز کی ادائیگی کے لئے ایک غلط امام کا انتخاب کیا تھا۔ پھر ایک دن ایک دبلا پتلا لاغر سا غیر مرئی لڑکا جس کی ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں، جلد سرمے کے رنگ کی تھی اور چہرے پر ایک

بڑی ہی بے کس داڑھی اُگی ہوئی تھی، دھول کی چادر سے نمودار ہوا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، چہرے کی ہڈیاں کھال کو توڑ کر نکل آنے کے لیے بے چین تھیں اور جسم کے مقابلے سر کافی بڑا تھا۔

''میں نے سنا ہے یہاں پیش امام کی جگہ خالی ہے۔'' اس نے سر سے ٹوپی اتار کر اپنے چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟''

☆

ایسا اس گاؤں میں کبھی نہیں ہوا تھا، مگر بوڑھے نے کہا؛ جو کبھی نہیں ہوتا اس کے ہونے کا امکان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ دراصل کسی حد تک اس بات کا تعلق نئے پیش امام سے تھا۔ اسے اس گاؤں سے بہت زیادہ امیدیں نہیں تھیں، مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اسے کوئی امید ہی نہ تھی۔ اور پھر اس نے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ پچھلی جگہ جہاں اس نے تھوڑے دن گذارے تھے، اپنی شہوانی خواہش سے مجبور ہوکر ایک یتیم لڑکی سے شادی کر لی تھی جسے وہ دوسرے ہی ہفتے پرانی جگہ سے لے آیا تھا۔ اکثر جمعہ کے خطبہ سے قبل وہ گاؤں والوں کے سامنے اپنی مانگیں پیش کرتا۔ گاؤں والے اپنی طرف سے کوشش بھی کرتے مگر ہر بار وہی ڈھاک کے تین پات۔ برسوں سے اس گاؤں کی یہی روایت رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر نوجوان پیش امام نے ہتھیار ڈال کر گاؤں والوں کو بددعا دینا شروع کر دیا۔

''ایسے گاؤں پر اولے برستے ہیں جہاں کا امام خالی پیٹ تارے گنتا ہے۔'' اس نے یہ جملہ جب جمعہ کی نماز پر خطبہ کی تقریر میں شامل کیا تو مصلیوں نے بیک زبان سر ہلا کر کہا: ''سبحان اللہ!''

اس ہفتے ایک دوپہر شدید گرمی اور حبس کے ساتھ آسمان اچانک سیاہ ہو گیا، زور کی بجلی کڑکی اور تیز بارش کے ساتھ اتنی شدید اولا باری ہوئی کہ کھیتوں کی زیادہ تر سبزیاں تباہ ہو گئیں۔ ''یہ ایک اتفاق ہے، کوئی اس کے لیے پیش امام کو ملزم نہ ٹھہرائے۔'' بوڑھے نے بچے سے کہا۔ شاید اس بات سے گاؤں کے ہر شخص کو اتفاق تھا۔ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر پیش امام کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کی عورت ٹھنڈے چولھے کے سامنے لمبا گھونگھٹ نکالے ہمیشہ بیٹھی رہتی ہے۔ گاؤں کے کسی شخص نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ تالاب میں پتھر پر کپڑا دھوتے وقت بھی وہ لمبا گھونگھٹ نکالے رہتی۔ پیش امام کے لیے کوئی الگ گھر نہ تھا۔ کچھ برس قبل گاؤں والوں نے مسجد سے ملحق ایک حجرہ بنانے کی کوشش کی تھی مگر اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ صرف اینٹ اور گارے کے چار ستون ہی کھڑا کر پائے تھے جن میں سے ایک ڈھ بھی چکا تھا۔ پیش امام نے اس کے کچے فرش پر مٹی اور گوبر کا لیپ چڑھا کر اور چوتھے ستون کی جگہ پر لکڑی کا ایک طوالہ ایستادہ کر کے سر پر ایک ترپال ٹانگ دیا اور کسی طرح اپنی بیوی کے لیے ایک پناہ گاہ بنا لی۔ اسے یقین تھا کہ برسات آنے تک گاؤں والے ان کے سر پر ایک چھپر کا انتظام کر دیں گے۔ پردہ کے لیے اس نے پرانے ٹاٹ اور گاؤں سے اکٹھی کی ہوئی چادریں اور ساڑیاں جن کے رنگ برسوں تک دھلنے کے سبب بالکل دھندلے ہو چکے تھے، لٹکا رکھی تھیں۔ یہ دیوار کا کام کرتی تو تھیں مگر ہوا میں ہمیشہ اپنے کمزور ٹانکوں سے نکلنے کی جدوجہد میں

مصروف نظر آتیں۔ گاؤں والوں نے اس حجرے کی تعمیر کے لیے چندے کی رسید چھپوا کر دور دراز کے علاقوں میں بھیجا، جہاں فرزندانِ توحید کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی اور گاؤں کے لوگ کام کی تلاش میں اکثر جایا کرتے، مگر ساٹھ فیصد کمیشن اور آمد و رفت نیز کھانے پینے کے اخراجات کے بعد خدا کے گھر کے لیے پیسہ برائے نام بچتا۔ دوسری طرف زیادہ تر لوگ رسید کے پیسے یا تو کھا جاتے یا سرے سے کتاب کے گم ہو جانے کا بہانہ تراش کر کے دستبردار ہو جاتے۔ نتیجتاً مہینے نکلتے گئے مگر اتنی رقم اکٹھی نہ ہو پائی کہ کسی طرح کا کام شروع ہو پاتا۔ گاؤں والوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ عارضی طور پر پھوس کے ایک چھپر کا انتظام کر دیا جس پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پھدکتی رہتیں اور گرگٹ اپنے سر اٹھائے نیلے آسمان کی طرف تاکتے رہتے۔ کل ملا کر نیا امام ابھی تک اپنی بیوی کے لیے اتنا ہی کر پایا تھا، جس کا اسے بہت ملال تھا۔ اس کا اظہار وہ لاشعوری طور پر اپنے جمعہ کے خطبے پر کیا کرتا۔ اولا باری کے واقعے کے دو ماہ بعد گاؤں والوں کو محسوس ہوا کہ اس کی روز کی بول چال میں کفر کی بو شامل ہونے لگی ہے، جب ایک دن اس نے ان علمائے دین کا پھر سے ذکر کیا جن کی بیویاں حمل کے دوران پیمبری کے دن گذارتی ہیں۔ ''بھوک...'' اس نے اپنی تقریر میں کہا۔ ''...شیطان کا سب سے مہلک ہتھیار ہے۔ انسان کبھی اسے استعمال نہ کرے ورنہ بچے ٹیڑھے میڑھے پیدا ہوں گے۔'' گاؤں والوں نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا ہوتا، اگر اگلے چار مہینے کے اندر گاؤں میں جو تین زچگیاں ہوئیں وہ سارے بچے پولیو زدہ نہ نکلتے۔

ہمیں اس کالی زبان والے پیش امام کے لیے کچھ کرنا چاہیے، گاؤں والوں نے آپس میں صلح و مشورہ کیا اور چاول اور سبزیاں اکٹھی کر کے مسجد کے صحن پر لے آئے۔ لیکن اب شاید پیش امام کو ضد ہو چکی تھی، کیونکہ ہر ہفتے وہ کوئی نہ کوئی چبھتا ہوا سوال لوگوں کے سامنے ڈال دیتا: ''طوفانِ نوح لوگوں کے گناہوں کا نتیجہ تھا۔ کیا خدا اب آسمان پر چپ بیٹھا رہے گا؟'' لوگوں نے بھاری بارش کی امید کی جو سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالنے والی تھی۔ یوں بھی برسات کا موسم آ چلا تھا، مگر چند چھٹ پٹ بارش کے علاوہ مہینے گذرتے چلے گئے اور بڑا سوکھا پڑا۔ پیش امام نے کہا، اگر اسے الٹ کر دیکھا جائے تو یہ ایک طرح کا طوفانِ نوح ہی تھا، جو سوکھے کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ اب پیش امام میلا کچیلا رہنے لگا تھا۔ وہ گاؤں میں جب بھی نظر آتا، مسکراتا رہتا جیسے اس کے سارے مسائل حل ہو چکے ہوں۔ ''بھئیّن لوگ خوب کھا پی رہے ہو۔ کھا پی لو۔ بس خدا کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں۔'' کبھی وہ گاؤں کی واحد چائے کی دکان پر بیٹھ جاتا، جہاں سورج نکلنے سے پہلے دہقان کھیتوں کا کام نپٹانے کے بعد جمع ہوتے۔ ''کھیتوں میں چوہوں کے بلوں کے اندر ہم عالموں کے مقابلے زیادہ اناج ہوتے ہیں۔'' ایک بار اس نے ایک کنویں کو بد دعا دی اور دیکھتے دیکھتے وہ کنواں سوکھ گیا۔ دوسری بار اس نے گاؤں پر ایک نحوست کے نازل ہونے کی بات کہی، جس کے دوسرے ہی دن ایک پولیس والا نمودار ہو گیا۔ وہ جس پیڑ پر تھوکتا، اس کے پتے گرنے لگتے۔ وہ جس مرغی کی طرف دیکھ لیتا وہ کُڑک ہو جاتی۔ اب تو ایسا لگنے لگا تھا جیسے اسے اپنی غیبی قوت کا اندازہ ہو چلا تھا، کیونکہ نہ صرف وہ کرّوفر سے چلنے کا عادی ہو گیا تھا بلکہ اب وہ کھلے عام یا اشارے سے لوگوں کی موت کی پیشن گوئی کرنے لگا تھا جیسے اس کے لیے اسے پیسے ملے

ہوں۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ گاؤں کے لوگوں کو موت کی شرح میں اضافہ نظر آنے لگا، یہ الگ بات تھی کہ وہ جن از کار رفتہ بوڑھوں کا ذکر کرتا، ان کے گھر والے کافی عرصے سے ان کی موت کا انتظار کرتے کرتے تھک چکے تھے اور انھوں نے مر کر نہ صرف خود کو ایک لمبی تکلیف دہ زندگی سے نجات دلائی تھی بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی راحت بخشی تھی۔ اس نے اپنی بد دعا سے کئی تالاب خشک کیے، امرود کے درختوں پر بان مارے، جنوں کو بلانے کے لیے رات رات بھر چلہ کسا اور جب اس کی بیوی کے مردہ بچہ پیدا ہوا تو وہ نرا پاگل ہو گیا۔ بچوں نے اطلاع دی کہ وہ مسجد میں غیر وقت میں غلط سمت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا ہے۔ جب گاؤں والوں نے اسے پیش امامی کے عہدے سے برطرف کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے سال بھر کی تنخواہ مانگی اور ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اس نے کہا وہ اپنا حق لیے بغیر ٹلنے والا نہیں۔ اس نے اپنے نوزائیدے کو قبرستان لے جانے کی بجائے تالاب کے کنارے ہی دفن کیا تھا، جہاں کی مٹی سال بھر گیلی رہتی، جس پر اُگائے گئے سجنا کے پیڑوں سے لاروے ٹپکتے رہتے جو تتلی بننے سے پہلے ہی کوؤں کی خوراک بن جاتے۔ وہ اس قبر کے سامنے دن دن بھر بیٹھا رہتا، سستی اگربتیاں جلاتا اور ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں جلائے رکھتا، یہاں تک کہ وہ منحنی سی قبر ایک خارپشت میں بدل گئی۔ آخر کار گاؤں والوں نے مسجد سے کترانا شروع کر دیا۔ وہ لوگ اس سے خوفزدہ تھے اور اس کی منحوس نظر کے سامنے آنا نہیں چاہتے تھے، مگر ادھر کچھ دنوں سے لوگ دیکھ رہے تھے کہ پیش امام چپ رہنے لگا تھا۔ وہ اپنا کھانا خود پکاتا، خود اپنے کپڑے دھوتا، ہینڈ پمپ سے پانی لاتا۔ جلد ہی اس کا راز کھل گیا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی دکھائی دینا بند ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے ٹاٹ کے پردے کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دیکھا، نہ صرف پیش امام کا چولھا ٹھنڈا پڑا تھا بلکہ انھیں اس کی بیوی بھی کہیں نظر نہ آئی۔ شاید وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی یا پیش امام اسے پچھلی جگہ چھوڑ آیا تھا۔ پیش امام مسجد کے اونچے صحن پر بیٹھا خندہ زن، یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ متواتر فاقوں کے سبب اس کی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، مگر وہ لوگوں کے اس بے جا تجسس سے قطعی پریشان نظر نہیں آیا۔ ''اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر اپنی ناقص داڑھی کے بال توڑتے ہوئے کہا، جو ایسا لگ رہا تھا جیسے کھال کے بجائے سیدھے ہڈیوں سے نکل آئے ہوں۔ ''اب مجھے نہیں معلوم میں اسے کہاں ڈھونڈوں گا۔ مگر واہ ری عورت، صبرِ ایوبی کی زندہ مثال تھی وہ۔ بھوک برداشت کرنے کی اتنی طاقت تو میں نے اور کسی کے اندر نہیں دیکھی۔''

بچے کی موت اور بیوی کے بھاگ جانے کے بعد پیش امام کے اندر اچانک ایک تبدیلی آ گئی۔ اس نے بد دعا دینا بند کر دیا اور نماز بھی درست کر لی۔ ایک دن مسجد کے چھپر پر چڑھ کر اس نے اس کی مرمت کی، اندر چھت گیری کے کنڈوں اور بانس کی کھپچیوں کو صاف کیا جو نہ صرف گھن کھائے ہوئے تھے بلکہ دنیا جہان کے حشرات الارض کے ٹھکانے تھے۔ اس نے کنڈوں سے مکڑیوں کے جالے صاف کیے جن سے تنکے، مکڑیوں کے انڈے اور بے جان کیڑے مکوڑے بھاری تعداد میں لٹک رہے تھے، دیواروں پر آویزاں طغروں کو جن میں کمخواب پر منبت کاری کے ذریعے قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں، نیچے اتار کر ان کے شیشے چمکائے، طاقچوں سے گرد جھاڑی، جزدان سے قرآن پاک کے نسخوں کو نکال کر دھوپ دکھائی اور تسبیح کے

دانوں کو لکڑی کے گملے میں ڈال کر میل کاٹنے والے پاؤڈر سے دھویا۔ اس کے اگلے ہفتے تالاب سے مٹی لا کر مسجد کا برآمدہ درست کیا جس میں پچھلی برسات چھپر سے پانی متواتر گرتے رہنے کے سبب ایک بڑا سا شگاف بن گیا تھا، فرش کی دڑاروں کو جو کنکھجوروں کے دائمی ٹھکانے بن گئی تھیں، مٹی کا لیپ چڑھا کر بند کیا۔ اس نے گاؤں کے لوہار سے کیلیں مانگ کر دروازے کے ساتھ ساتھ میت کی چارپائی کی مرمت کی، جو لوگوں کے کندھوں پر خطرناک ڈھنگ سے ہلنے لگی تھیں، جائے نماز کے پھٹے ہوئے حصوں کی پیوند کاری کی۔ وہ دن کے وقت یہ سب کچھ کرتا مگر رات رات بھر مسجد کے برآمدے پر بیٹھا دور تک ڈھلانوں کی طرف تا کا کرتا، جن پر کھڑے مڑے تڑے نیم جان درختوں کے اوپر تاروں سے ڈھکا آسمان کسی مچھیرے کے جال کی طرح مغرب کی طرف سرکتا جاتا۔ ان ستاروں کی طرف تاکتے ہوئے جانے کیوں اسے ایسا لگتا جیسے آسمانی مچھیرا اپنی جگہ کھڑا اس جال کو اپنی طرف سمیٹ رہا ہو جس میں یہ تارے مچھلیوں کی طرح پھنس کر چاروناچار گھسٹتے جا رہے ہوں۔ اس نے لوگوں کے گھروں میں جانا بند کر دیا تھا۔ وہ کھانے کی کوئی بھی دعوت قبول نہ کرتا۔ ’’جب دانت تھے تب چنے نہ تھے، جب چنے ملے تو دانت نہیں۔‘‘ وہ ہنس کر کہتا اور اپنے بچے کی قبر کی طرف اشارہ کرتا، ’’اسے کہتے ہیں عقلمندی، جب بندہ پیدا ہونے سے انکار کر دے اور اپنے آپ کو دنیا کی آلودگی سے بچا لے۔‘‘ وہ کہتا۔ ’’برے انسان کو کپڑے اچھا بنا دیتے ہیں، جس طرح ہمارے برے اعمال کو دولت ڈھانپ لیتی ہے۔‘‘ ’’جب اتنا کچھ ہوا تو باقی بھی ہو جائے گا۔‘‘ ’’ایک مسجد میں لاکھوں گنہگار سما سکتے ہیں مگر ایک اچھے انسان کے لیے سو مسجدیں بھی کافی نہیں ہوتیں۔‘‘ ’’جو پیسہ عرب سے آئے، صرف وہ پاک ہے، باقی سب جہنم کی آلودگی ہے۔‘‘ ’’ایک وہ وقت بھی آئے گا اور ڈرو اس وقت سے جب حرام اور حلال کا فرق مٹ جائے گا، پیسوں کی بہتات ہوگی اور ہر طرف حاجی ہی حاجی دکھائی دیں گے، الّو ویرانوں سے انسانی بستیوں پر اتر آئیں گے، بچے کھوٹے پیدا ہوں گے اور عورتوں کی جسمانی بھوک کبھی نہیں مٹے گی لیکن بچے پیدا ہونے سے انکار کر دیں گے۔‘‘

پھر ایک دن گاؤں میں اچانک شور مچ گیا، ’’پیش امام پاگل ہو گیا ہے، پیش امام پاگل ہو گیا ہے۔‘‘ لوگ باگ کام کاج چھوڑ کر مسجد کی طرف بھاگ رہے تھے جس کے سامنے پیش امام مادر زاد برہنہ کھڑا مسجد کے چھپر کی طرف تاک رہا تھا، جسے اس نے آگ لگا دی تھی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور اپنی داڑھی نوچ رہا تھا۔ اس پر اتنی شدید وحشت طاری تھی کہ وہاں پر جمع لوگ مسجد کے قریب جانے کی جرأت اکٹھی نہیں کر پا رہے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے ہمت یکجا کر کے اپنے طور پر تالاب سے ڈول میں پانی بھر بھر کر آگ بجھانے کی کوشش کی، مگر پیش امام کے خوف سے وہ مسجد کے قریب جانے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ دور ہی کھڑے ڈول سے پانی پھینکتے رہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسجد کا چھپر جلتا رہا اور پیش امام قہقہے لگاتا رہا۔ کھپریل کا چھپر جل کر مسجد کی دیواروں کے بیچ زمیں بوس ہو چکا تھا، جس سے اڑتی چنگاریوں سے نہ صرف پیش امام کی رہائش گاہ کے چھپر نے آگ پکڑ لی تھی بلکہ ڈوبتے سورج کے سبب سرخ آسمان تک اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس نے بھی آگ پکڑ لی ہو۔ پیش امام اسی برہنہ حالت میں جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، سارا گاؤں اس کے

تعاقب میں تھا۔ حال کی ایک موسلا دھار بارش کے سبب پیڑ پودے چمک اٹھے تھے اور چٹانیں دھل کر صاف ہو گئی تھیں۔ چھوٹے موٹے جانور اور کیڑے مکوڑے اس اچانک کے شور سے گھبرا کر افراتفری میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ گاؤں والے پیش امام کا تعاقب کرتے ہوئے کوڑھیوں کے نالے تک پہنچ گئے، جہاں چٹانوں کے درمیان تیز پانی بہہ رہا تھا۔ پیش امام اس آخری چٹان پر رک گیا جو نالے کے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ اس سے بس ایک قدم کی دوری پر وہ ساٹھ فٹ گہری کھائی تھی، جس کے اندر چٹانوں کے بیچ نالا شور مچاتے ہوئے بہہ رہا تھا۔ اپنی پشت نالے کی طرف پھیر کر وہ گاؤں کے لوگوں کی طرف رخ کر کے کھڑا تھا اور سرخ آنکھوں سے ان کی طرف تاک رہا تھا، جیسے اسے اس کھیل میں مزا آ رہا ہو۔ لوگ ایک محفوظ فاصلے پر سانس روکے کھڑے تھے اور اس کے اگلے قدم کا انتظار کر رہے تھے کہ پیش امام کی داڑھی کا رخ آسمان کی طرف ہو گیا، وہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر جیسے خدا سے مخاطب ہوا، ایک وحشیانہ قہقہہ بلند کیا اور مڑ کر نیچے کھائی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ اس طرح اڑتا ہوا نیچے گیا تھا جیسے کوئی چڑیا ہو، جس کے بال و پر نوچ لیے گئے ہوں۔

گاؤں والے جب چٹان پر اس جگہ پہنچے جہاں سے پیش امام نے چھلانگ لگائی تھی تو انھوں نے دیکھا، نیچے نالے میں پیش امام کا جسم ایک چٹان پر پڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ کر غلط سمت میں مڑ گئی تھی، داہنا ہاتھ جسم کے نیچے دبا ہوا تھا اور کھوپڑی کے چور ہو جانے سے بھیجہ باہر آ گیا تھا۔ آس پاس کے درختوں کے پرندے آسمان میں شور مچاتے ہوئے اڑ رہے تھے اور کوڑھی اپنے اپنے جھونپڑے سے نکل کر پیش امام کے بے جان جسم کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

☆

ابھی ابھی ایک مال گاڑی پل کو دہلاتے ہوئے گذری تھی جس کا دھواں تیزی سے ہوا میں پھیل رہا تھا۔

دھوپ کی غیر موجودگی میں پل کے نیچے کا پانی بالکل سیاہ نظر آ رہا تھا۔ پانی سے نظر ہٹا کر بوڑھے نے بچے کی طرف دیکھا جو پل کی ایک محراب سے باہر آ رہا تھا۔

’’تم پلیا کے نیچے کیا کر رہے ہو؟ یہاں آؤ، میں نے بہت دیر سے تمہارے ساتھ کوئی بات نہیں کی ہے۔‘‘

بچہ طوعاً کرہاً اپنے دادا کے پاس لوٹ آیا۔ اسے دادا کی نظروں میں رہتے ہوئے کھیلنا پسند تھا، مگر اب اس کے اندر اس قید سے آزادی کی چاہت جاگنے لگی تھی۔ بظاہر وہ آج بھی اپنے پرانے جنون میں جی رہا تھا مگر ان دنوں کیڑوں مکوڑوں کے علاوہ کسی اور چیز نے اس کے ذہن پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ’’اپنے ہاتھ دکھاؤ‘‘ دادا نے کہا۔ وہ چھتری کے مڑے ہوئے حصے سے کمر ٹکائے دونوں کہنیوں کو ہتھیلیوں سے تھامے چادر میں لپٹے کھڑے تھے جیسے چھتری کے ہٹتے ہی زمین پر جا گریں گے۔ بچے نے پتھر پھینک کر دادا کے سامنے اپنی دونوں مٹھیاں کھول دیں۔ اس کی ہتھیلیاں برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ ملائم جلد سے کائی

کی مہک بھی آ رہی تھی۔ دادا اس کی منحنی انگلیوں کو دبا دبا کر دیکھنے لگے، ''تم بھر پیٹ کھایا کرو۔ کہیں تمہارے پیٹ میں جونک تو نہیں۔ بچے! یہ عمر دبلا ہونے کے لیے نہیں ہے۔ جب میری عمر کو پہنچو گے تب یہ انگلیاں تم پر جچیں گی، ابھی نہیں۔''

انھوں نے بچے کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بھوؤں پر ہتھیلی کا سائبان بنا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ ہوا تیز بہہ رہی تھی جس میں ایک واحد چیل اپنے پر پھیلائے ترچھا اڑتی چلی جا رہی تھی۔ دور تک ماحول میں سنّاٹا طاری تھا۔

''دادا'' لڑکے نے کہا۔ ''آجکل اتنی لال چیونٹیاں کیوں نظر آ رہی ہیں۔''

''کیونکہ وہ لال ہیں اور یہ رنگ جلد نظر آ جاتا ہے۔ یوں بھی یہ موسم چیونٹیوں کا ہے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ اس نے ایک بار پھر آسمان پر نظر دوڑائی۔ آج اسے کسی وجہ سے آسمان پر اعتراض تھا جو سورج کی عدم موجودگی میں کسی گندے ترپال کی طرح ٹنگا ہوا تھا۔

''اور پولیس مولی صاحب کی لاش اٹھا کر کیوں لے گئی؟''

''اس ملک کا یہی قانون ہے۔ ایسے معاملات میں لاش کو ہسپتال لے جانا پڑتا ہے، اس کی چیر پھاڑ کرنی پڑتی ہے۔ بڑے ہو جانے پر تمھیں اس طرح کے سوالات کی ضرورت نہ ہوگی۔'' بوڑھے کے چہرے سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یہ موضوع پسند نہ تھا۔ اس نے اسے بدلنے کی کوشش کی، ''مجھے حیرت ہے، تمھارا چیونٹیوں کا جنون ختم ہو گیا۔ ویسے تم اب سیاہ چیونٹیوں پر غور کر سکتے ہو، وہ بے ضرر ہوتی ہیں۔''

''دنیا میں کوئی چیز بے ضرر نہیں ہوتی۔'' بچے نے کہا۔ ''آپ نے ہی کہا تھا، ہر کوئی اپنی ضرورت کے مطابق اچھا یا برا ہوتا ہے۔''

''کیا میں نے ایسا کہا تھا؟'' بوڑھا ہنسا۔ ''پھر تو ثابت ہو گیا کہ میں واقعی سٹھیا گیا ہوں۔''

''مگر مولی صاحب نے مسجد کو آگ کیوں لگائی؟''

''کیونکہ یہ اس کے اندر کی آگ تھی،'' بوڑھے نے کہا۔ ''اسے کبھی نہ کبھی تو باہر آنا ہی تھا اور بچے! دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ہمارے پاس خدا سے بہتر چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟''

''لوگ کہتے ہیں اس نے اپنی بیوی کو مار ڈالا تھا۔''

''کیونکہ لوگ کچھ بھی کہنے سے باز نہیں آتے، آخر اللہ نے انھیں ایک منھ جو دے رکھا ہے۔'' بوڑھے نے پھر سے موضوع بدلنے کی کوشش کی، ''اور تم پلیا کے نیچے نہ جایا کرو۔ ایسا کیا ہے اس کمزور پل میں جو تم وہاں جاتے رہتے ہو؟''

بچے کو خود پتہ نہ تھا وہ اس پل کے نیچے کیوں جایا کرتا تھا، شاید محرابوں سے لٹکتے چمگادڑوں کی کشش اسے وہاں لے جاتی ہو۔ دونوں اپنی جگہ کھڑے تھے، جب ہوا میں ایک تیز بھنبھناہٹ ابھرنے لگی جیسے سینکڑوں بھنورے اور تتیا ایک ساتھ گا رہی ہوں اور جن میں جھینگر شامل ہو گئے ہوں۔ بوڑھے نے اپنا سر ہلایا، ''لگ رہا ہے کوئی طوفان آنے والا ہے۔ ہمیں جلد گاؤں پہنچ جانا چاہیے۔'' وہ مڑ کر گاؤں کی طرف چل

پڑا۔ ٹیلے سے اترتے ہوئے وہ کسی ایسی ناؤ کی طرح ڈگمگا رہا تھا، جس کے بادبان میں تیز ہوا بھر گئی ہو۔ ''اور تم کیا سوچ رہے ہو؟ جلدی کرو ورنہ ہم طوفان میں گھر جائیں گے۔'' اس نے چھتری کھول کر مڑے بغیر بچے سے کہا جو اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا پل کی طرف تاک رہا تھا۔ پل پر بارش اتر چکی تھی۔ اسے اپنی کھوپڑی پر بارش کے ایک دو بھاری بھرکم قطروں کے گرنے کا احساس ہوا اور وہ دوڑتا ہوا دادا کی چھتری کے نیچے جا گھسا۔ دادا نے اپنی چادر سے فوری طور پر اس کے کندھوں کو ڈھک لیا۔

''احتیاط سے، احتیاط سے، پیر پھسل گئے تو کافی چوٹ آئے گی۔ یہ ایک بے رحم زمین ہے۔''

بچے نے حیرت سے دادا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دادا کی جگہ کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہو۔

وہ آدھے راستے پر تھے، جب بارش نے انھیں آلیا۔ ہوا کافی تیز ہو گئی تھی جس میں دادا کے لیے چھتری سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، مگر وہ چلتے رہے۔ ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں وہ پناہ لیتے۔ بارش میں گاؤں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ پتھریلی زمین پر جہاں گھاس اور مٹی کے سبب پھسلن ہو رہی تھی احتیاط سے پیر رکھتے ہوئے چل رہے تھے، جانے کیوں بچے کو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بارش اگلے سو سال تک ہوتی رہے گی۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، جب اچانک بارش کا زور کم پڑ گیا اور دیکھتے دیکھتے بارش رک گئی جیسے کسی نے آسمان پر ٹونٹی بند کر دی ہو۔ اب نہ صرف گاؤں دکھائی دینے لگا تھا بلکہ مغربی آسمان پر سورج بھی پوری تاب کے ساتھ نکل آیا تھا۔ سورج کی طرف حیرت سے تاکتے ہوئے، جس کا نچلا حصہ سرخ ہوتا جا رہا تھا، وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو بچے کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ادھر زمین پر بارش کا کوئی نشان نہ تھا۔ اسے گاؤں کے باہر لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ نظر آئی۔ بچہ کو گاؤں کی طرف لپکتے دیکھ کر بوڑھے نے اسے روک لیا، ''ذرا صبر سے کام لو۔ دادا کے بارے میں بھی سوچو۔ گاؤں کہیں بھاگا نہیں جا رہا ہے۔''

وہ جوہڑ کے کنارے، جس کا پانی تقریباً سوکھ چکا تھا، کاش کے مرجھائے ہوئے سفید پھولوں کے ساتھ چل رہے تھے، جب بچے کی نظر ایک سرخ نالے پر پڑی جو ڈھلان سے نکل کر جوہڑ کے کنارے سے ہوتا ہوا گاؤں کے اندر چلا گیا تھا۔ کچھ لوگ نالے کے قریب کھڑے ایک ٹک اس کی طرف تاک رہے تھے۔ بچے نے غور سے نالے کو دیکھا اور چیخ کر دادا کی کمر تھام لی، ''لال چیونٹیاں! دادا، یہ تو چیونٹیوں کے دل ہیں۔''

واقعی یہ چیونٹیوں کا ایک مہیب قافلہ تھا جو نالے کی شکل میں مٹی، پتھر اور خس و خاشاک کو تقریباً ڈھکتا ہوا چل رہا تھا۔ کچھ چیونٹیوں کے پر نکل آئے تھے، جن کے غول قافلے کے اوپر دھوئیں کی شکل میں اڑ رہے تھے۔ وہ کلبلاتے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے، گاؤں جس کے چاروں طرف کھیتوں میں لوگ اپنے ساز و سامان اور ڈھور ڈھنگر کے ساتھ بکھرے پڑے تھے۔ پالتو جانور اور انسانوں کے درمیان مرغیاں آزادی سے کٹکٹاتے ہوئے ادھر اُدھر بھاگ رہی تھیں جب کہ کمبل سے ڈھکے ایک تختہ پوش پر رکھے تار کے بڑے سے پنجرے کے اندر ایک توتا اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ مرد گاؤں کے اندر

راحت کے کام میں لگے ہوئے تھے اور بچے کھچے لوگوں اور سامانوں کو نکالنے میں مصروف تھے۔ بچے کو گاؤں کے تقریباً تمام کتے ننگے کھیتوں میں بھاگتے نظر آ گئے۔ وہ بری طرح بھونک رہے تھے، مگر آج ان کے بھونکنے کا انداز بالکل جدا تھا، جیسے مشکی باجوں میں چھید ہو گئے ہوں۔ شاید شروع میں انھوں نے بغیر سوچے سمجھے چیونٹیوں پر حملہ بول دیا تھا، جس کے نتیجے میں ان کے جسموں پر چیونٹیاں چڑھ آئی تھیں۔ وہ شور مچاتے ہوئے اپنی دُموں کو بھنبھوڑ رہے تھے، زمین پر لوٹ رہے تھے، سر اور مقعد کو مٹی پر رگڑ رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ میں ہر طرف سے مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ انسانوں اور جانوروں کا ملا جلا یہ شور ہی تھا، جسے شاید انھوں نے دور سے بھنوروں اور تتیوں کی آواز سمجھ لیا تھا۔ اور جب کہ آسمان کے کنارے دھیرے دھیرے سورج افق پر بتدریج بڑا ہوتا جا رہا تھا؛ بچے نے دیکھا، جوہڑ کے دوسرے کنارے سارا گاؤں، اس کی دیواریں، اس کے چھپر، برآمدے اور اوسارے، اس کے چاروں طرف پھوٹتی پگڈنڈیاں اور ان پر کھڑی بیل گاڑیاں، طوالوں پر ایستادہ اناج گھر اور پیال کے گول پشتارے؛ یہاں تک کہ تاروں سے لٹکتے کپڑے تک، چیونٹیوں کے سبب سرخ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

نسیم حجازی نے تاریخ کو فکشن کے رنگ میں رنگ دیا، اس نے عوام کی سوچ کو شدید متاثر کیا۔ دراصل 'تہذیب کے ٹکراؤ کی تھیوری' کے خالق Samuel Huntington نہیں بلکہ نسیم حجازی تھے۔ یکے بعد دیگرے مختلف ناولوں میں انھوں نے مسلمان مجاہد ہیرو متعارف کرائے جو یہودیوں، عیسائی اور ہندوؤں کے خلاف لڑتے تھے۔ اس صنف ادب کو اپنانے والے دیگر مصنفین، جیسا کہ طارق اسماعیل ساگر نے غیر ملکی محاذوں پر ہونے والی بین المذاہب کشمکش کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے پاکستان کے مد مقابل سی آئی اے اور را کو لا کھڑا کیا۔ ابتدا میں اشفاق احمد اس گروہ میں شامل نہیں تھے لیکن ضیا دور کے بعد انھوں نے بھی صوفی ازم کی آڑ میں اتھارٹی کے سامنے اطاعت اور فرماں برداری کا درس دیا۔ اسی طرح بشریٰ رحمٰن نے خواتین کے ویسے ہی مثالی کردار تراشے جیسے نسیم حجازی کے ناولوں میں مسلمان مردوں (مجاہدین) کے ملتے ہیں۔ نسیم حجازی کا ناول ''داستان مجاہد'' جہاد اور شہادت کو ایسا معمول بنا کر پیش کرتا ہے کہ ہر مسلمان گھرانہ اس کا متمنی ہوتا ہے۔ ان ناولوں کے قارئین کی دنیا میں منٹو اور فیض کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دراصل نسیم حجازی کے ناولوں نے وہ ذہنی زمین تیار کی ہے، جس میں ملا آسانی سے انتہا پسندی کا بیج بو سکتے ہیں۔ اسی فصل کا پھل تشدد ہے۔

ڈاکٹر عائشہ صدیقہ

(ملٹری سائنٹسٹ اور سیاسی تجزیہ نگار، پاکستان)

مذہب اور سیاست: امتزاج، تصادم اور علیحدگی

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر مبارک علی عالمی شہرت یافتہ مورخ ہیں، آپ کا شمار پاکستان کے روشن خیال دانشوروں میں ہوتا ہے۔ اردو اور انگریزی کے متعدد جرائد میں تاریخ اور سماجی موضوعات پر ان کے عالمانہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ کے مختلف عنوانات پر ان کی تقریباً چالیس کتابیں منظر عام پر آ کر علمی حلقوں میں داد وصول کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون ممالک ہونے والے متعدد سیمینار اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان کی زیر ادارت سہ ماہی ''تاریخ'' ۱۹۹۹ سے باقاعدہ شائع ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی پیدائش تو راجستھان کے ٹونک علاقہ میں ہوئی لیکن تقسیم کے بعد آپ حیدر آباد سندھ میں آباد ہوئے۔ ۱۹۶۳ میں سندھ یونیورسٹی سے تاریخ میں ماسٹر کرنے کے بعد ۱۹۷۶ میں جرمنی سے پی ایچ ڈی کی۔ سندھ یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے اور جرمن کلچر سنٹر، گوئٹے انسٹی ٹیوٹ، لاہور کے ڈائریکٹر بھی رہے۔

مذہب اور سیاست دونوں اقتدار کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ مذہب عقیدے کی بنیاد پر لوگوں کے جذبات و احساسات کو استعمال کر کے اقتدار کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے، تو سیاست تدبیر، زیرکی، سازش، مسلح طاقت اور لوگوں کی رائے اور اجتماعی خواہشات کے تحت اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرتی ہے۔ لہٰذا، اقتدار کے حصول میں مذہب اور سیاست دونوں کے طریقہ ہائے کار میں فرق ہوتا ہے۔ مذہب سیاست کو اپنا تابع بنا کر اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ الٰہی منصوبوں کی تکمیل کرے گا، لہٰذا اس کے اقتدار کی بنیاد الٰہی قوانین پر ہوتی ہے کہ جن کے نفاذ کے بعد وہ معاشرے کی اصلاح کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سیاست کی بنیاد اس اصول پر ہوتی ہے کہ معاشروں پر حکومت کے لیے نظام سیاست اور قوانین کو حالات و ماحول کے تحت بدلتے رہنا چاہیے تاکہ انسانی معاشرہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہ رہے اور برابر حرکت پذیر رہے۔ یہ وہ بنیادی فرق ہے جو مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے متصادم کر دیتا ہے۔

مذہب اور سیاست کے تصادم اور فرق کے نتیجہ میں تین ماڈل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اول؛ جب مذہب اور سیاست اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے اتحاد بنا لیتے ہیں اور ایک

توازن کے ساتھ دونوں اقتدار میں باہم شریک ہوجاتے ہیں۔ اس کو ہم مذہب و سیاست کا امتزاج کہتے ہیں۔ دوم؛ جب سیاست مذہب کو اپنا تابع کر کے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے، تیسری صورت میں ان دونوں میں تصادم اور ٹکراؤ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں مذہب و سیاست ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں اور دونوں علیحدہ علیحدہ دائرہ کار میں رہتے ہوئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔

کسی بھی مذہب کی ابتدا اور اس کے پھیلاؤ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر مذہب ایک خاص ماحول، حالات اور وقت میں ابھرتا اور پھیلتا ہے، اس لیے مذہب کا ردعمل اپنے وقت کے مسائل اور حالات سے ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے حالات بدلتے ہیں، اسی طرح سے نئے نئے مسائل سامنے آتے ہیں اور مذہب کے لیے یہ لازمی ہوتا ہے کہ ان مسائل کو اپنی تعلیمات سے مطابقت کرتا رہے۔ لیکن ایک مرحلہ وہ آتا ہے جہاں اس کی تشکیل مکمل ہوجاتی ہے، اس کے بعد مذہب کی تعلیمات میں یہ گنجائش کم ہوجاتی ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ مثلاً اسلام میں راسخ العقیدگی کی تکمیل میں ڈھائی سو سال کا عرصہ لگا کہ جس میں اس کا فقہی نظام مکمل ہوا۔ لہٰذا، جب بھی کسی مذہب میں راسخ العقیدگی (Orthodoxy) کا نظام مکمل ہوجاتا ہے تو اس کے لیے تبدیلی کا ساتھ دینا مشکل ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تبدیلی اس کی مضبوط اور پائیدار بنیادوں کو کمزور کر دے گی۔ اس مرحلہ پر مذہب کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں:

(۱) تبدیلی کے عمل سے درگذر کر کے سختی سے عقائد پر قائم رہا جائے، تبدیلی کی ہر کوشش کو جبر و تشدد سے دبا دیا جائے یا اگر مذہبی رہنماؤں کے پاس سیاسی قوت نہ ہو تو اس صورت میں فتوؤں اور بیانوں کے ذریعہ اس کی مذمت کی جائے، اور جو لوگ تبدیلی کے خواہاں ہیں انھیں کافر، مرتد، دشمن، سازشی کہہ کر لوگوں کو مشتعل کر کے ان سے دور رکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ لوگ ان کی بات نہ سنیں اور نہ ان کی تحریریں پڑھیں۔

(۲) دوسرا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں اور لوگوں کی خواہشات کو دیکھتے ہوئے تبدیلی کو قبول کر لیا جائے اور کوشش کی جائے کہ انھیں مذہبی رنگ دے دیا جائے اور مذہب کی نئے سرے سے تاویل اور تفسیر کی جائے۔

(۳) تیسرا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ اگر ان تبدیلیوں سے مقابلہ نہ ہو سکے، اور انھیں قبول نہ کیا جا سکے تو پھر دنیا سے علیحدگی اختیار کر کے معاشرتی سرگرمیوں سے دور رہا جائے۔

چنانچہ پہلا ردعمل جارحانہ ہوتا ہے، دوسرا سمجھوتہ کا اور تیسرا علیحدگی کا۔

معاشرے میں وہ لوگ جو تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی جو مذہب سے دستبردار بھی ہونا نہیں چاہتے؛ یہ لوگ تبدیلی اور عقیدہ میں سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور مذہب کی تعلیمات کی اس طرح سے تاویل اور تفسیر کرتے ہیں جو ان کے مقاصد کو پورا کرے۔ اس لیے مذاہب میں نئے نئے فرقے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جب ان کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے تو یہ فرقے ختم ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے فرقے لے لیتے

ہیں، مثلاً عیسائیت میں جب بورژواطبقہ کو کاروبار میں سود کی حرمت کی ضرورت ہوئی تو کیل ون (Calvin, d.1594) نے اپنی تعلیمات میں اسے جائز قرار دے دیا، جس نے کاروبار میں ان کی رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ اس وجہ سے ہر مذہب میں احیا، قدامت پرستی اور جدیدیت کی تحریکیں متحرک رہتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ اپنی کامیابی کے لیے سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے۔ کیوں کہ سیاسی اقتدار کے ذریعہ یہ اپنی تعلیمات اور اپنے قوانین کو نافذ کر سکتی ہیں۔ اگر وعظ و تبلیغ سے دنیا تبدیل ہو سکتی تو پھر سیاسی اقتدار کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے موجودہ دور میں ہر مذہبی تحریک جمہوری روایات یا مسلح جدوجہد کے ذریعہ سے حکومت پر قبضہ کر کے اپنے منصوبوں کی تکمیل چاہتی ہے۔

تاریخی عمل کا ایک اہم اور غور طلب پہلو یہ ہے کہ اس میں ہر معاشرہ سادگی سے پیچیدگی کی طرف جاتا ہے، لہٰذا اس صورت میں معاشرے کے اداروں، قوانین، روایات اور رسوم و رواج اور رویوں میں برابر تبدیلی آتی رہتی ہے۔ سائنسی ایجادات اور ٹکنالوجی انسان کی زندگی میں تبدیلیاں لے کر آتی ہے۔ اس صورت حال میں ہر مذہب کے لیے یہ مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا ساتھ دے سکے۔ ایک مرحلہ پر آ کر اس کی توانائی اور تخلیقی صلاحیت جواب دے دیتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا جب مذہب معاشرے کے دوسرے شعبوں سے علیحدہ ہو کر خود کو عبادات اور روحانی تربیت کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔

خاص طور سے موجودہ زمانہ میں جب تبدیلی کی رفتار انتہائی تیز ہے اور علم کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے، ان حالات میں سیاست، معیشت، سائنس اور ٹیکنالوجی کے امور میں پروفیشنل لوگ آ گئے ہیں۔ مذہبی علما کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ علم کے اس پھیلاؤ پر قابو پاتے ہوئے، مذہبی تعلیمات کو ان سے ہم آہنگ کریں۔ اسی وجہ سے اکثر معاشروں میں مذہب، سیاست و معیشت اور سائنس سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اس کا وہ تسلط جو قرون وسطیٰ کے معاشروں میں تھا، ٹوٹ گیا ہے۔

(۱)

اسلامی تاریخ میں مذہب و سیاست کے درمیان جو رشتہ اور تعلق رہا ہے، اس کا اظہار خصوصیت سے عباسی انقلاب کے بعد ہوا (۷۵۰)، کیوں کہ اس نے مذہب اور سیاست کے درمیان تصادم کو ایک فیصلہ کن حیثیت دے دی۔ چونکہ سیاسی انقلاب لانے والے اور اسے کامیاب بنانے والے ایرانی تھی، اس لیے نئے ریاستی انتظام اور اداروں میں ان کا غلبہ و تسلط قائم ہو گیا۔ وہ عباسی خلیفہ کو ایرانی بادشاہ کی طرز پر مطلق العنان بنانا چاہتے تھے، جس کی ذات میں سیاست و مذہبی اختیارات جمع ہو جائیں۔ اس کے مقابلے میں علما کی جماعت تھی جو خلیفہ کو شریعت کے دائرہ میں رکھتے ہوئے اور محدود اختیارات کا حکمراں بنانے کے خواہش مند تھے۔ لیکن سیاسی و فوجی اختیارات ایرانیوں کے ہاتھ میں تھے، اس لیے اس کشمکش میں علما کو کامیابی نہیں ہوئی اور ایرانی بیوروکریسی نے خلیفہ کو مطلق العنان بنا کر اسے ایرانی بادشاہت کے قالب میں ڈھال لیا۔ لیکن اس تصادم کے نتیجہ میں یہ فیصلہ ضرور ہوا کہ خلیفہ سیاسی معاملات میں ریاستی امور میں بااختیار ہوگا مگر وہ شریعت میں دخل نہیں دے گا اور نہ ہی اسے تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ (۱)

اس کے نتیجہ میں ایک ایسا سیاسی نظام وجود میں آیا کہ جس میں حکمراں کو لامحدود سیاسی اختیارات حاصل تھے جن کا نفاذ وہ بیوروکریسی کے ذریعہ کرتا تھا۔ اس نظام میں علما کی شرکت بطور قاضی، مفتی اور محتسب کے ہوئی کہ جس نے انھیں ریاست کا ملازم بنا دیا تھا۔ ملازم ہونے کی حیثیت سے وہ سیاست کے تابع ہو گئے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ علما جو کہ ریاست کے ملازم تھے، یا ریاست کے وظیفہ خوار، اور مدد معاش حاصل کرنے والے تھے، وہ حکمرانوں کی خوشنودی میں مصروف رہتے تھے۔ یہ حکمراں اگرچہ علما کی قدر کرتے تھے، ان کے وعظ اور نصیحتیں سنتے تھے، اور مذہبی رسومات کی پابندی کرتے تھے مگر دوسری طرف جب ضرورت پڑتی تھی تو ان علما سے اپنے مقاصد کے لیے فتوے بھی حاصل کرتے تھے، لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ علما نے دربار کی ایرانی رسومات و آداب جن میں پابوسی، سجدہ وغیرہ شامل تھے، ان کے بارے میں فتوے دے کر انھیں جائز قرار دے دیا۔ اس طرح نماز، روزے اور دوسرے اسلامی ارکان سے انحراف کے لیے بھی حیلے تلاش کر لیے، حکمرانوں کی جنسی تسکین کے لیے کئی شادیوں اور کنیزوں کی اجازت دے دی۔ عباسی دور میں جیسے جیسے خلیفہ کی سیاسی طاقت بڑھتی رہی، اسی طرح سے علما کی حیثیت کمزور ہوتی چلی گئی اور خلفا نے مذہب کو اپنے تابع بنا لیا۔

(۲)

عباسی خلافت کی کمزوری اور زوال کے نتیجہ میں جو صوبائی خودمختار حکمراں خاندان ابھرے، انھوں نے بادشاہت کے ادارے کو روشناس کرایا۔ اس ادارے کو مسلمان فقہا اور مفکرین نے اس دلیل کی بنیاد پر تسلیم کر لیا کہ اس کی وجہ سے معاشرہ بدامنی اور لاقانونیت سے محفوظ رہے گا۔ دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اگر کوئی طاقت اور فوج کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کرے اور غاصبانہ طور پر حکومت پر قابض ہو جائے تو کیا اسے جائز حکمراں تسلیم کیا جائے گا؟ الماوروں (وفات ۱۰۵۸) نے اپنی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' میں ایسے غاصب کو جائز حکمراں تسلیم کرنے کا مشورہ دیا ہے، کیوں کہ دوسری صورت میں خانہ جنگی اور ابتری کا اندیشہ ہوگا۔ (۲) جب بادشاہت کے ادارے اور غاصب کو جائز حکمران تسلیم کر لیا گیا تو اب مسلمان مفکرین کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بادشاہ کی حیثیت کا تعین کس طرح کیا جائے؟ کیا بادشاہ مذہب کے تابع ہوگا، یا مذہب اس کے مقاصد کی تکمیل کرے گا؟ اس مقصد کے لیے جو ''ادب'' تخلیق ہوا، اس نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ ان کتابوں میں کیکاؤس (وفات: ۱۰۸۲) کی ''قابوس نامہ''، نظام الملک (وفات: ۱۰۹۱) کا ''سیاست نامہ، غزالی (وفات: ۱۱۱۱) کی ''نصیحت الملوک'' اور ضیاالدین برنی کی ''فتاویٰ جہاں داری'' قابل ذکر ہیں۔ ان تحریروں نے بادشاہت کے ادارے اور اس کے موروثی عنصر کو تسلیم کرتے ہوئے بادشاہ کو ''ظل اللہ'' کا درجہ دے کر اسے خودمختار اور بااختیار بنا دیا۔ جس طرح میکاولی نے یورپ کے بادشاہوں کو مذہب اور اخلاق کی قید سے آزاد کر کے انھیں مطلق العنان بنایا تھا، اس ادب نے بھی بادشاہ کو شریعت کی پابندی سے آزاد کر دیا، ان کا ماڈل ساسانی بادشاہ تھا جس کی ذات میں سیاسی و مذہبی دونوں اختیارات تھے۔ لہٰذا، بادشاہ کے اختیارات اور لامحدود طاقت کو مذہب کی بجائے اخلاق کے ذریعہ کنٹرول کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور اس کی

سب سے بڑی خوبی عدل کو قرار دیا گیا، جس کی سب سے بڑی علامت ایران کا بادشاہ نوشیرواں تھا۔

ہندوستان میں سلاطین نے اس ماڈل کو اختیار کیے رکھا۔ لیکن مغل حکمرانوں میں اکبر نے جس نظریۂ بادشاہت کو اختیار کیا، وہ اس سے مختلف تھا۔ اس نظریہ کی فلسفیانہ بنیاد ابوالفضل (وفات: ۱۶۰۲) نے فراہم کی۔ اس کے مطابق خدا کے نزدیک مرتبۂ شاہی سے زیادہ بلند اور کوئی مقام نہیں ہے، کیوں کہ اس سے دنیا میں سرکشوں کو زیر کیا جاتا ہے اور بغاوتوں کا خاتمہ کر کے انسانوں کو صراط مستقیم پر چلایا جاتا ہے۔ بادشاہی جاہ وجلال کا نتیجہ ہے کہ دنیا بدامنی اور فساد سے محفوظ ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ بادشاہت کی روشنی خدا کی ذات سے ظہور پذیر ہوتی ہے، اسے وہ ''فرایزدی'' یا ''الوہیت کی روشنی'' کہتا ہے۔ یہ مرتبہ شاہی خدا کی جانب سے کسی برگزیدہ شخصیت کو ملتا ہے، اس پر وہ اعلیٰ نور چھا جاتا ہے جس سے مرعوب ہو کر نوع انسانی اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ (۳)

ابوالفضل کے اس نظریۂ بادشاہت پر تبصرہ کرتے ہوئے انینا کا کہنا ہے کہ اگرچہ بظاہر اس نظریہ میں روایتی ایرانی اسلامی اور ہندو اثرات نظر آتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ ابوالفضل کے مطابق عادل بادشاہ آفاقی سچائی اور نیکی کی غرض سے حکومت کرتا ہے، اس مقصد کے لیے وہ عوام کی فلاح و بہبود کی غرض سے قدیم روایات اور اداروں کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ چونکہ بادشاہ کو الٰہی روشنی ملتی ہے، اس لیے علما اور مجتہد اس کے درمیان دخل نہیں دے سکتے ہیں، بادشاہ کو ان کی ہدایات کی ضرورت نہیں، وہ ضرورت کے مطابق معاشرہ میں تبدیلیاں لا سکتا ہے۔ لہٰذا، ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے اکبر نے بچپن کی شادی، قریبی رشتہ داروں میں شادی، جبر کی شادی اور ستی کی مخالفت کی۔ ہندوستان میں حکمران نے پہلی مرتبہ ان معاملات میں دخل دیا جو اب تک روایتی طور پر برادری، ذات اور خاندان کی حدود میں تھے۔ ابوالفضل کے نظریۂ بادشاہت کے مطابق بادشاہ آفاقی فلاح کے لیے الٰہی قوانین کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ (۴)

اکبر نے اپنے اختیارات کو اس وقت اور وسیع کیا جب اس کے صدر الصدور عبدالنبی نے ایک برہمن کو توہین رسالت کے جرم میں قتل کرا دیا۔ اس موقع پر اکبر نے ابوالفضل کے والد شیخ مبارک سے کہا کہ وہ اس کی رہنمائی کریں کہ وہ ان علما سے کیسے نجات پائے؟ اس پر شیخ مبارک نے مشورہ دیا کہ اکبر علما کی اجازت سے مجتہد کے اختیارات حاصل کر لے۔ چنانچہ ۱۵۷۹ میں اکبر نے تمام علما سے ایک محضر پر دستخط کرائے، جس کے بعد علما اور مجتہد اس کے ماتحت ہو گئے اور بادشاہ کی ذات میں دنیاوی اور مذہبی اختیارات دونوں مل گئے۔ اب اکبر اپنی تمام رعایا کا یکساں محافظ تھا، جس کے تحت ہندو اور مسلم ایک تھے۔ مزید برآں اس نظریہ کے تحت وہ دنیاوی اور مذہبی قوانین سے بالا ہو گیا۔

ضیاالدین برنی نے اپنی کتاب ''فتاویٰ جہاں داری'' میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ شریعت کی روشنی میں اور شرعی قوانین کے تحت حکومت کرے۔ کیوں کہ آئین جہاں داری و جہاں بانی اور شریعت کے درمیان فرق ہے۔ اس لیے بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جاہ وجلال و شان و شوکت اور فخر و تکبر کو قائم رکھے۔ دربار کی رسومات جس میں سجدہ کرنا اور قدم بوسی شامل ہیں، عالیشان محلات میں

رہنا، خزانہ کو مال و دولت سے بھرنا، اور اس کا ذاتی استعمال میں لانا، اور فضول خرچی کرنا؛ یہ سب مجبوراً جائز ہیں کیوں کہ بادشاہ کا احترام اس وقت ہوتا ہے جب اس کے پاس دولت، شان و شوکت اور عظمت ہو۔(۵)

اس ضمن میں ضیاالدین برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں علاالدین خلجی اور قاضی مغیث کی گفتگو دی ہے، جس میں سیاسی معاملات میں قاضی نے علاء الدین کی پالیسیوں کو غیر شرعی بتایا۔ اس پر علاء الدین نے اسے جواب دیا کہ ''میں نہیں جانتا کہ میرے یہ احکامات مشروع ہوتے ہیں یا نا مشروع؟ جس چیز میں صلاح ملک دیکھتا ہوں اور جو کچھ مجھے مصلحت وقت کے تحت نظر آتا ہے، اس کا میں حکم دے دیتا ہوں۔''(۶)

چنانچہ حکمرانوں نے سیاسی و مذہبی اختیارات کو حاصل کرنے کے بعد جن قوانین، ضوابط اور قواعد کو نافذ کیا، ان کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ سیاست سے تھا۔ چونکہ بادشاہ ظل اللہ اور نائب خدا تھا، اس لیے اس کے خلاف جو بغاوت ہوتی تھی تو باغی اس کے مجرم ہوتے تھے، اس لیے ان لوگوں کو سزا دینے کا اختیار اسے تھا۔ لہٰذا، سیاسی اور باغی مجرموں کو شرعی سزائیں نہیں دی جاتی تھیں، انھیں اذیتیں دینا، جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور پھانسی پر لٹکانا یہ سب بادشاہ کے اختیار میں تھا۔ علاء الدین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور نہ صرف یہ کہ باغیوں کو سزا دی، بلکہ ان کے خاندان والوں کو، جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے تھے، انھیں قید کر کے اذیت دی گئی۔ بقول برنی؛ ''مردوں کے جرم کی پاداش میں ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے کا رواج اس تاریخ سے شروع ہوا ہے۔''(۷)

اس ماڈل کے تحت فقہا اور مجتہد ریاست کے ملازم ہو گئے تھے جو ملازمت میں نہیں تھے، انھیں ریاست کی جانب سے وظائف اور مدد معاش کے طور جاگیریں دی جاتی تھیں۔ اس لیے اب حکمراں انھیں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور جب چاہتا تھا، کسی بھی قسم کے فتوے ان سے حاصل کر لیتا تھا۔ تاریخ میں اس قسم کے لاتعداد فتاویٰ موجود ہیں، جو بادشاہوں نے وقتاً فوقتاً ان سے حاصل کیے۔ یہاں مغل تاریخ سے چند مثالیں دی جاتی ہیں، مثلاً جب اکبر پر یہ اعتراض ہوا کہ اس نے چار سے زیادہ شادیاں کی ہیں، لہٰذا اس کی یہ بیگمات اس کی جائز بیویاں نہیں۔ اس پر اکبر کو شدید فکر ہوئی اور اس نے عبادت خانہ میں، جس کی بنیاد ۱۵۷۵ میں فتح پور سیکری میں رکھی تھی، علما سے کہا کہ وہ اس کا حل تلاش کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علما نے قرآن شریف کی اس آیت سے جس میں دو دو اور تین تین اور چار چار شادیوں کا ذکر ہے، اس تاویل کے مطابق:

۲+۳+۴=۹ یا

۲+۲+۳+۳+۴+۴=۱۸

اس کی شادیوں کو جائز قرار دیا۔ عبدالقادر بدایونی نے یہ تجویز دی کہ مالکی فقہ میں چونکہ متعہ جائز ہے، اس لیے اگر اس مسلک کا قاضی فتویٰ دے تو یہ شادیاں جائز ہو جائیں گی۔ اکبر نے اسی وقت فقۂ حنفی کے قاضی کو برطرف کر کے مالکی قاضی کا تقرر کر دیا۔ اس نے فوراً ہی فتویٰ دیا، جب اس فتویٰ نے یہ شادیاں جائز قرار دے دیں تو اکبر نے قاضی کو معطل کر دیا تا کہ دوسرے لوگ اس فتویٰ سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔(۸)

اورنگ زیب نے جب دارا شکوہ اور مراد کو قتل کرایا، تو اس نے ان کے قتل کو سیاسی کی بجائے مذہبی بنایا اور اس مقصد کے لیے دارا شکوہ پر الحاد اور ارتداد کو وجہ قرار دیا، اور مراد کو قصاص میں سزا دی گئی، اگرچہ یہ بات واضح تھی کہ وہ سیاسی طور پر اپنے بھائیوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا مگر اس نے سیاست کی بجائے مذہب کا سہارا لیا اور علما نے اس کی مرضی کے مطابق فتوے دے دیے۔

ایک دوسرے واقعہ میں جب وہ دکن میں تھا تو ستارا کے قلعہ کے محاصرے کے دوران چار مسلمان اور نو ہندو گرفتار ہو کر آئے، اس نے ان کے بارے میں قاضی سے فتویٰ پوچھا، اس نے کہا کہ اگر ہندو مسلمان ہو جائیں تو انھیں رہا کر دینا چاہیے اور مسلمانوں کو قید میں رکھنا چاہیے۔ اورنگ زیب کو یہ فتویٰ پسند نہیں آیا، کیوں کہ وہ ان کو سزا دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے قاضی پر غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حنفی فقہ کی بجائے دوسرے فقہا سے بھی سند لینے کی گنجائش ہونی چاہیے۔ اس پر قاضی کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کی کیا مرضی ہے۔ چنانچہ اس نے دوسرا فتویٰ دیا کہ قیدیوں کو عبرت کے لیے قتل کر دینا چاہیے۔ چونکہ یہ اس کی مرضی کے مطابق تھا، لہٰذا ہندو اور مسلمان دونوں قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔

ایک طرف تو اورنگ زیب نے مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا لیکن جب مذہب نے سیاست کو اپنے لیے استعمال کرنا چاہا تو اس نے اس کی مخالفت کی۔ مثلاً جب اس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہندوؤں اور شیعوں کو اپنی انتظامیہ سے نکال دے تو اس کا جواب تھا کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں، انھیں آپس میں نہیں ملانا چاہیے۔ اس اصول کے تحت جب کچھ علما نے دکن کی اسلامی ریاستوں کے خلاف جنگ کو خلاف شریعت کہا تو اس نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، اور نہ اس وقت کی جب ایک عالم نے اس سے کہا کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی کیوں نہیں کرتا، کیوں کہ یہ خلاف شرع ہے تو اس نے یہ بھی سنی ان سنی کر دی۔(۹)

بادشاہت کے اس ماڈل کے خلاف جس میں اسے سیاسی اور مذہبی اختیارات حاصل تھے، اسلامی معاشرے میں وقتاً فوقتاً علما کی جانب سے مختلف تحریکیں اٹھتی رہیں جن میں کوششیں ہوئیں کہ سیاست کو شریعت کے ماتحت کیا جائے، ان میں امام حنبل کی تحریک قابل ذکر ہے جنھوں نے مامون اور معتزلہ کے نظریہ ''خلق قرآنی'' کی مخالفت کی اور خلیفہ کی جانب سے سزائیں برداشت کیں۔ ان کے مسلک کے ماننے والے شرعی معاملات میں بڑے سخت تھے۔ لہٰذا، عباسی دور میں انھوں نے کئی مرتبہ مختلف شہروں میں شرعی نظام کو ریاست کے قوانین سے بالاتر ہو کر نافذ کرنے کی کوشش کی، مثلاً بغداد میں یہ بازاروں میں جاتے، دکان داروں کو ڈراتے دھمکاتے، شراب کی دکانیں توڑ دیتے، رقص و موسیقی بند کرا دیتے، اپنے مخالفوں پر حملے کرتے، خلیفہ کے خلاف مظاہرے کرتے کیوں کہ وہ شرعی امور کا پابند نہیں ہوتا تھا اور لوگوں پر جبر کرتے کہ ان کے مسلک کی پیروی کریں۔(۱۰)

دوسری اہم تحریک ابن تیمیہ (وفات: ۱۳۲۸) کی ہے، ان کا تعلق بھی حنبلی مسلک سے تھا اور یہ علما کو شرعی و سیاسی معاملات میں با اختیار بنانا چاہتے تھے اور اس کے حامی تھے کہ زندگی کے ہر پہلو میں شریعت کا

نفاذ ہو۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جو نیا نظریہ دیا، وہ یہ تھا کہ خلیفہ یا حکمراں کی بجائے علما کو اختیارات حاصل ہوں تا کہ وہ شرعی قوانین کو نافذ کریں۔

ہندوستان میں مہدوی تحریک اس کی مثال ہے جو پندرھویں صدی میں سید محمد مہدی جونپوری نے شروع کی۔ ان کی تحریک احیا کی تھی جس میں وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور پاکیزگی کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ سولھویں صدی میں یہ تحریک گجرات میں مقبول ہوئی مگر اپنی شدت اور انتہا پسندی کی وجہ سے ناکام ہوئی اور بالآخر اپنے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئی۔

اس قسم کی تحریکیں جس مسلمان ملک اور مسلمان حکمراں کے خلاف چلیں، انھیں سختی سے کچل دیا گیا، کیوں کہ کوئی حکمراں یہ برداشت کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اس کی ریاست میں ایک اتھارٹی یا ریاست قائم ہو جو اس کے اختیارات کو چیلنج کرے۔ اس لیے ان تحریکوں نے اگرچہ سیاسی نظام اور قوانین کو چیلنج تو کیا مگر معاشرے کی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنانے میں ناکام رہیں۔

(۳)

ریاست کا دوسرا ماڈل وہ تھا جس میں مذہب کا سیاست پر غلبہ تھا اور مذہب سیاسی اداروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس قسم کی حکومت کی دو شکلیں ہوتی تھیں۔ ایک تو حکمراں اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے شریعت کو لازمی سمجھتے ہوئے اس کا نفاذ کرتا تھا، اس سے علما کو ریاستی معاملات میں بالا دستی مل جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ اقتدار پر علما کا قبضہ ہو جاتا تھا اور وہ ریاست کے ذریعہ مذہبی قوانین کا نفاذ کرتے تھے۔ اس قسم کی مذہبی حکومتیں جہاں بھی قائم ہوتیں، چاہے وہ مغرب میں ہوں یا اسلامی ملکوں میں؛ ان کی خاص بات یہ ہوتی تھی کہ وہ بنیادی طور پر انسانی فطرت کو بدعنوان اور شر پسند سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کی فطرت کو قابو میں رکھنے کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ جبر و تشدد ہو اور سخت سزائیں ہوں جو لوگوں کی اصلاح کر سکیں اور ایک پاکیزہ و صاف معاشرے کا قیام ممکن ہو۔ ان کا دوسرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ چونکہ دنیاوی حکمراں بد عنوان ہوتے ہیں، اس لیے علما ہی لوگوں کو راہ حق پر لا سکتے ہیں۔ مغرب میں اس کی مثال عیسائی مصلح کیل ون (Calvin, d.1599) کی ہے جس نے سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہاں اس نے حکومت کا جو پروگرام بنایا، وہ اس کے مذہبی نظریات پر تھا۔ چونکہ اسے شہری حکومت کی سیاسی طاقت و اقتدار کی حمایت تھی، اس لیے اول تو اس نے یہ اعلان کیا کہ جو افراد اس کے مذہبی نظریات کے مخالف ہیں، وہ شہر چھوڑ دیں۔ اس کے بعد ان افراد کے لیے جو اس کی تعلیمات کی خلاف ورزی کرتے تھے، ان کے لیے اس نے سخت سزائیں دیں، ان میں عیسائیت سے اخراج، جلاوطنی، قید اور موت کی سزائیں شامل تھیں۔ اس کی اصلاحات کے نتیجہ میں شہر کے وہ تمام ہوٹل اور سرائے بند کر دیے گئے جو مسافروں کو عیاشی کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ وہ تاجر جو کم تولتے تھے یا ملاوٹ کرتے تھے، انھیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ فحش گانوں اور تاش کے پتوں پر پابندی لگا دی گئی، ہر جگہ بائبل رکھ دی گئی، وعظ کے دوران ہنسنے والوں کو سزا دی جاتی تھی،

ضروری تھا کہ کھانے سے پہلے خدا کا شکر ادا کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ جنیوا کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ہر فرد اور خاندان روحانی پولس کی نگرانی میں رہتا تھا، اس کے احکامات پر اس قدر سختی سے عمل ہوتا تھا کہ معمولی سے انحراف پر سخت سزا دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک بچہ کا اس جرم میں سر اڑا دیا گیا کہ اس نے اپنے والدین کو مارا تھا۔ ٦ سال کے عرصہ میں ١٥٠ منحرفین کو زندہ جلا دیا گیا۔

لیکن بہت جلد جنیوا کے شہری اس جبر و تشدد سے تنگ آ گئے اور بالآخر انھوں نے کیلون کو شہر سے نکال کر اس نظام کا خاتمہ کر دیا۔ (١١)

اس ماڈل کو ہم نجد اور حجاز میں اٹھتی ہوئی تحریک کی شکل میں اسلامی دنیا میں دیکھتے ہیں۔ یہ تحریک جو وہابی کہلاتی ہے، اس کا بانی محمد ابن عبدالوہاب (وفات: ١٧٩٢) تھا۔ اس کی تعلیمات اور مذہبی خیالات سے محمد ابن سعود متاثر ہوا، جس کے نتیجہ میں دونوں خاندانوں میں شادی بیاہ کے ذریعہ باہمی رشتے مضبوط ہوئے۔ جب اس خاندان کے ایک فرد سعود (وفات: ١٨١٤) نے عرب میں فتوحات حاصل کیں، اور بالآخر سعودی خاندان حجاز و نجد میں کامیاب ہو کر حکمراں بنا تو انھوں نے وہابی مسلک کو ریاست کے جبر و تشدد سے اپنے ملک میں نافذ کیا۔ ان کے نزدیک مزارات کی زیارت، وہاں نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھانا، یہ سب ناجائز تھا۔ اس لیے انھوں نے مزاروں کو مسمار کر دیا اور ان کے قیمتی سامان کو لوٹ لیا۔ یہ تمباکو اور حقہ اور پائپ کے بھی مخالف تھے، اور اسے مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ سلک اور ساٹن کے لباس کے استعمال کو بھی شریعت کی خلاف ورزی گردانتے تھے۔ نماز اور دوسرے ارکین کی پابندی تشدد سے کراتے تھے اور نماز کے وقت لوگوں کو کوڑے مار مار کر مسجد میں بھیجتے تھے۔

وہابیوں نے اسلامی معاشرے کا جو ماڈل دیا، اس سے دوسرے اسلامی معاشرے بھی متاثر ہوئے اور ان میں بھی احیائے اسلام کی تحریکیں اس مقصد کے تحت ابھریں کہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے مذہبی معاشرے کی تشکیل کی جائے۔ ہندوستان میں سید احمد شہید (وفات: ١٨٣١) کی جہاد تحریک اس زمرے میں آتی ہے۔ انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے سرحد میں اسلامی حکومت کو قائم کیا اور ١٨٢٧ میں اپنے خلیفہ اور امام ہونے کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے اپنی حکومت میں جس پالیسی پر عمل کیا، وہ بھی جبر و تشدد پر قائم تھی۔ چنانچہ اس بارے میں مرزا حیرت نے ''حیات طیبہ'' میں جو واقعات لکھے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک خالص و پاکیزہ معاشرے کے قیام کے لیے طاقت اور زبردستی لازمی تھی۔

''شرعی احکام ناگوار صورت میں پبلک کے آگے پیش کیے جاتے تھے۔ سید صاحب نے صدہا غازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شرع محمدی کے مطابق عمل درآمد کریں، مگر ان کی بے اعتدالیاں حد سے بڑھ گئی تھیں۔ وہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ ان سے نکاح کر لیں۔ بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور سے دو تین دوشیزہ لڑکیاں جا رہی ہیں، مجاہدین میں سے کسی شخص نے پکڑا اور زبردستی مسجد میں لے جا کر نکاح پڑھایا...... ایک ایک چھوٹے ضلع قصبہ گاؤں میں ایک ایک عمال سید صاحب کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ وہ بے چارہ جہانداری کیا خاک کر سکتا تھا، الٹے سیدھے شریعت کی آڑ میں نئے نئے

احکام بے چارے غریب کسانوں پر جاری کرتا تھا۔۔۔۔۔ کھانا پینا، بیٹھنا اٹھنا، شادی بیاہ کرنا سب ان پر حرام ہوگیا تھا۔۔۔۔۔ معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ ہو جانا کچھ بات ہی نہ تھی۔۔۔۔۔ ذرا کسی کی لبیں بڑھی ہوئی دیکھیں اس کے لب کتر دیے، ٹخنوں سے نیچے تہمد دیکھی ٹخنہ اڑا دیا۔'' (۲۱)

اس ماڈل کا تجربہ موجودہ دور میں افغانستان نے طالبان کی قائم کردہ حکومت میں کیا۔ ایک دوسرا نمونہ ایران میں ۱۹۸۹ میں علما کی حکومت ہے جس نے شرعی نظام کے نفاذ کے لیے ریاستی جبر و تشدد کو پوری طرح استعمال کیا۔ لیکن اب ایرانی عوام اس استبدادی حکومت کے آہنی پنجوں سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۴)

انیسویں صدی میں اسلامی دنیا ایک اور بحران سے گذری۔ یہ یورپی نوآبادیات کا پھیلاؤ تھا جس نے اسلامی ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آہستہ آہستہ ان ملکوں پر اپنا سیاسی تسلط جما لیا۔ اب نوآبادیاتی نظام میں شریعت کی جگہ ایک نیا قانون نافذ ہوا۔ نوآبادیاتی ریاست نے اپنے مفادات اور تقاضوں کے تحت نئے قوانین بنائے۔ غیر ملکی سیاست کے غلبہ اور اقتدار نے مذہب کو سیاست سے علیحدہ کر دیا۔

اس صورت حال میں اسلامی ملکوں میں دو قسم کی تحریکیں اٹھیں۔ ایک تو مذہبی احیا کی تحریکیں تھیں جو نوآبادیاتی نظام کے خلاف تھیں اور ان کے تسلط کا خاتمہ کر کے شرعی نظام کا نفاذ چاہتی تھیں۔ جیسے سوڈان میں مہدی سوڈانی اور لیبیا میں سنوسی تحریکیں، یا پھر وہ احیا کی تحریکیں تھی جو سیاست سے دور رہتے ہوئے مسلمان معاشرہ میں مذہبی تعلیمات کے فروغ کے لیے کوشاں تھیں۔ یہ اس بات کی حامی تھیں کہ نوآبادیاتی حکومتوں سے کوئی تعاون نہ کیا جائے، اور علیحدگی میں رہتے ہوئے اپنی مذہبی شناخت کو برقرار رکھا جائے۔ ہندوستان میں دیوبند اپنے ابتدائی دور میں سیاست سے علیحدہ رہا، جب کہ بریلوی مسلک اور فرنگی محل کے علما نے سیاست سے دوری رکھتے ہوئے مذہبی امور پر توجہ دی۔ لیکن نوآبادیاتی نظام نے جدیدیت کے جس عمل کو شروع کیا تھا، اس نے اسلامی معاشرے پر گہرے اثرات ڈالے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے معاشرے کی ساخت ہی کو نہیں بدلا، بلکہ لوگوں کی عادات، رویوں اور ذہن کو بھی بدل ڈالا۔ یورپ سے آنے والے نئے نظریات جن میں نیشنل ازم، سوشل ازم، مارکس ازم اور معیشت میں آزاد منڈی کا نظریہ؛ یہ وہ نئے افکار تھے جنھوں نے معاشرے کی قدیم روایات کو پاش پاش کر دیا۔ مذہب میں ان نئی تبدیلیوں اور نظریات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی، اس لیے اس نے اپنی حفاظت کے لیے دفاعی طریقوں کو استعمال کیا اور تخلیقی راستوں سے دور رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مذہب میں ٹھہراؤ آ گیا اور اس کے پاس بدلتے حالات سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی، تو اس میں شدت اور انتہا پسندی پیدا ہوئی جس نے آگے چل کر بنیاد پرستی کو مضبوط کیا۔ (۳۱)

جب اس نظام میں ایک یورپی تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا تو اس نے یورپ اور اس کی جدیدیت اور ترقی سے متاثر ہو کر یورپ کو اپنے لیے ایک ماڈل بنایا، جس میں سیاست اور مذہب دونوں علیحدہ کر دیے

گئے۔ مذہب کی حیثیت نجی ہوگئی اور سیاست و معیشت اس سے آزاد ہوگئیں تا کہ وہ بلا کسی رکاوٹ کے اپنے مقاصد میں سرگرم عمل رہیں۔

مذہبی رویوں میں اس وقت مزید تبدیلی آئی جب ان ملکوں میں نوآبادیاتی اقتدار کے خلاف تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کی بنیاد نیشنل ازم پر تھی، لہٰذا یہ یا تو علاقائی و جغرافیائی بنیادوں پر تھا، یا لسانی اور اِتھنک تھا۔ کیوں کہ اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائی، یہودی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی تھے۔ نیشنل ازم نے ان سب کو متحد کر دیا اور ان کی مذہبی شناخت کو پس پشت ڈال دیا۔ مثلاً، عرب نیشنل ازم میں مسلمان اور عیسائی عربی زبان کی بنیاد پر ایک ہو گئے۔ ہندوستان میں مسلمان جغرافیائی و علاقائی اور اتھنک نیشنل ازم میں تقسیم ہو گئے۔

آزادی کے بعد جب ان ملکوں میں قومی ریاست کا قیام عمل میں آیا، تو اب معاشرے میں ہر فرد مذہب و ذات و برادری اور نسل سے بالاتر ہو کر قوم کا حصہ بن گیا۔ ریاست کے دستور میں شہری کا جو تصور ہے، اس میں ریاست کی نظر میں سب شہری برابر ہیں اور بنیادی حقوق رکھتے ہیں۔ ریاست کے سیاسی اور معاشی ادارے اپنی جگہ مذہب سے آزاد اور خود مختار ہیں۔ اس نئے ڈھانچہ میں مذہب فرد کا نجی معاملہ ہو گیا۔

پاکستان میں اس کے برعکس اس کی کوشش ہوئی کہ ریاست کو اسلامی بنایا جائے اور سیاست و معیشت پر مذہب کے تسلط کو قائم کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی قوم پرستی کی وجہ سے معاشرے کی غیر مسلم اقلیتیں کٹ کر علیحدہ ہوگئیں۔ پاکستان کے شہری دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور اقلیتیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہوگئیں۔ معیشت میں مذہب کی مداخلت نے معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ اس لیے ہمارے معاشرے میں مذہب اور سیاست کے تعلق اور رشتہ کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوگا، پاکستان اور اس کا معاشرہ اسی طرح دوراہے پر کھڑا رہے گا۔

(۵)

مذہب اور سیاست کے بارے میں اس پس منظر کے بعد ہم یہ تجزیہ کر سکتے ہیں کہ جب مذہب اور سیاست میں امتزاج ہوا تو اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سیاست کا مذہب پر غلبہ ہوا یا مذہب کا سیاست پر، تو ان دونوں صورتوں میں ایک استبدادی سیاسی نظام ابھر کر آیا جس میں معاشرے کو فرماں بردار اور تابع بنا کر رکھ دیا اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو سلب کر لیا گیا۔ ریاست کو اپنے مخالفین کو دبانے اور کچلنے کے لیے مذہبی و اخلاقی جواز مل گئے۔ علما و سیاست داں یا مدبرین اور مجتہدین نے ایک ہو کر معاشرے پر حکمراں طبقے کی بالادستی کو مضبوط و مستحکم کر دیا۔ اس صورت حال میں ملک کے ذرائع اور لوگوں کی توانائیاں ان طبقوں کو خوشحال رکھنے میں صرف ہوگئیں۔

یہی صورت حال اس وقت رہی جب مذہب اور سیاست میں سیاسی اقتدار کے لیے کشمکش اور تصادم رہا۔ اس صورت میں دونوں نے اپنی قوت و طاقت ایک دوسرے کو شکست دینے میں صرف کر دی۔ اگر

ریاست پر مذہب کا کامل تسلط رہا تو اس صورت میں جبر و تشدد کے ذریعہ لوگوں کو مذہب کا پابند بنایا گیا، ان کی زندگی سے تمام ثقافتی و سماجی سرگرمیوں کو ختم کردیا گیا۔ اس کی مثال سعودی حکومت ہے جہاں تیل کی آمدنی سے معاشی خوشحالی تو ہے مگر معاشرہ میں ثقافتی سرگرمیوں اور تخلیقی عمل کا فقدان ہے جس نے اس معاشرے کی زندگی کو فکری و ثقافتی طور پر پسماندہ بنادیا ہے۔

لیکن جب بھی سیاست پر مذہب کا زور کم ہوا، یا اسے سیاست سے علیحدہ رکھا گیا تو معاشرہ میں تخلیقی صلاحیتیں ابھریں اور فلسفہ و ادب، سائنس اور ٹکنالوجی، آرٹ اور تعمیرات وغیرہ میں ترقی ہوئی۔ اس کی مثال عباسی عہد سے دی جاسکتی ہے کہ جب عباسی خلفا کی سرپرستی میں علوم و فنون میں ترقی ہوئی، اسی طرح اکبر کے عہد میں فکری و ادبی نظریات کا فروغ ہوا۔ جب سیاست مذہب کے اثرات سے آزاد ہوتی ہے تو وہ نئے نظریات کو اختیار کرتے ہوئے نہیں جھجکتی، لیکن جب مذہب کا غلبہ ہو تو ہر جدید نظریہ دشمنی کا روپ اختیار کرلیتا ہے اور معاشرہ اپنی ہی قدیم روایات میں سکڑتا چلا جاتا ہے۔

اگر مذہب کو سیاست سے علیحدہ کردیا جائے تو اس سے مذہب کمزور نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ مذہب کی اصل طاقت لوگوں کے عقیدے میں ہوتی ہے، حکومت کی حمایت میں نہیں۔ جب ریاست اس کی حمایت کرتی ہے تو مذہب اس کا تابع ہوجاتا ہے جس سے مذہب کی عقیدت کمزور ہوجاتی ہے۔ جب بھی مذہب سیاسی و معاشی امور میں دخل دے کر انھیں اپنے سانچہ میں ڈھالتا ہے تو ناکامی کی صورت میں مذہب تنقید کا نشانہ بنتا ہے۔ اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ سماجی و نیچرل علوم میں جس قدر تیزی سے ترقی ہو رہی ہے، معیشت جن تبدیلیوں سے دوچار ہے، اس میں مذہب ان کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے۔ اس لیے اگر مذہب ؛ سیاست و معیشت سے علیحدہ ہوکر خود کو مذہبی امور تک رکھے تو اس صورت میں مذہب کا وقار قائم رہے گا اور معاشرہ بھی آزادی کے ساتھ ترقی کر سکے گا۔

حوالہ جات

۱۔ منٹگمری واٹ؛ "The Majesty that was Islam", London, 1974; p.108-120

۲۔ الماوردی: ’’الاحکام السلطانیہ‘‘ (اردو ترجمہ)، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۶۶۔

۳۔ ابوالفضل: ’’آئین اکبری‘‘، کلکتہ، ۱۸۶۷۔۱۸۷۷ء، آئین I، ص ۲۔۴۔

4. Eugenia,"Vanina: Ideas and society in India from the Sixteenth to Eighteenth Centuries", OUP, Delhi, 1995, pp.59-72.

۵۔ ضیا الدین برنی: ’’فتاوائے جہانداری‘‘: تصحیح و مقدمہ و حواشی؛ مسز اے سلیم خاں، ادارہ تحقیقات پاکستان و دانش گاہ، پنجاب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۶۷۔۱۲۶۔۱۶۶۔

۶۔ ضیاالدین برنی: ’’تاریخ فیروز شاہی‘‘ (اردو ترجمہ)، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۳۴۔

۷۔ ایضاً: ص ۳۷۸، ۳۷۹۔

۸۔ مبارک علی: ’’علما اور سیاست‘‘، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۶۳۔

۹۔ مبارک علی: مرتب ’’اورنگ زیب عالمگیر‘‘، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۔۱۲

10. Ira Lapidus: "A History of Islamic Societies", Cambridge, 1988, p.167

11. J.A. Merriman: "A History of Modern Europe: From the Renaissance to Present", Pantheon, New York, 1978, p.119

۱۲۔ مرزا حیرت دہلوی: ’’حیات طیبہ‘‘: اسلامی اکیڈمی، اردو بازار، لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۲۸۰۔

13. Bassam Tibi: "The Crisis of Modern Islam", University Utah Press, 1988, p.7

[’’تاریخ کی تلاش‘‘، ڈاکٹر مبارک علی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء]

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کرسکتی، جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کردیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا، اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں، وہ انھیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گئی، اس کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا، مگر اسے چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی جکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گردوپیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کرسکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

(غبار خاطر)

میرا خدا

علی شریعتی

ترجمہ: شہرام سرمدی

ڈاکٹر علی شریعتی مشہور ایرانی دانشور اور اسلامی اسکالر تھے۔ ۱۹۶۴ میں انھوں نے فرانس کی مشہور سوربورن یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وطن واپسی پر وہ دوبارہ مشہد یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے۔ ایک ماہر عمرانیات کی حیثیت سے آپ نے مسلم معاشرے کے مسائل کو آفاقی اصولوں کی روشنی میں پرکھنا شروع کیا، ان کی اس تجدد پسندی سے خائف ہو کر حکومت ایران نے ان کا تبادلہ مشہد سے تہران کردیا۔ بعد میں ان کے لیکچرز پر پابندی عائد کردی گئی اور انھیں قید کرلیا گیا۔ تاہم عوامی دباؤ اور بین الاقوامی احتجاج کے باعث انھیں رہا کردیا گیا۔ بہرحال ان پر اپنے خیالات کی اشاعت اور اپنے طالب علموں سے ملاقات کرنے پر پابندی برقرار رکھی گئی۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر علی شریعتی نے برطانیہ ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا لیکن شاہ کے کارندے وہاں بھی ان کا پیچھا کرتے رہے اور بالآخر ۱۹ جون ۱۹۷۷ کو انھیں شہید کردیا گیا۔

میرا خدا نہ کعبے کے اطراف ہے
نہ کلیسا کے
نہ عبادت خانے کے

میرا خدا یہیں ہے
میری کیفیت دل کے پہلو میں
میرے رُندھے ہوئے گلو میں
میرے قہقہوں میں

میرا خدا
مجھے ڈراتا نہیں آگ سے
لیکن
ڈراتا ہے مجھے
کسی کا دل توڑنے سے
کسی آنکھ میں آنسو لانے سے اور
حقدار کو ناحق کرنے سے

میرا خدا دیکھتا ہے مجھے
جہاں کہیں بھی میں ہوں
مجھے سمجھتا ہے خواہ کسی زبان میں بھی بولوں
میرے خدا کے حواس ہر حال میں
میری جانب ہیں

میرا خدا مجھے کسی سے بھی ڈراتا نہیں ہے
سوائے بغیر سوچے سمجھے گفتگو کرنے سے اور
کسی دل کو رنجیدہ کرنے سے
میرا خدا

تمام تر مہربانیوں کا خدا ہے
میں ترجیح دیتا ہوں کہ اپنے جوتوں کے ساتھ
سڑک پر چلوں اور خدا کو سوچوں
بجائے اس کے کہ مسجد میں بیٹھوں اور
اپنے جوتے کی فکر کروں

نجیبہ عارف کی دو نظمیں

پنڈولم

شاعری، موسیقی و تصویر کاری
فلسفہ، اعلیٰ ادب اور بلیک کافی
بارشیں، تنہائیاں، خاموشیاں
خواب کی کھڑکی سے باہر کیسی کیسی بازی
گاہیں
اور ادھر گھٹنوں تلک فضلے کی دلدل
بے بسی کے قہقہوں کا ایک محشر
خون کے گارے میں لتھڑی زندگی
جس کے چہرے پر خراشیں
اور ہونٹوں پر دہکتی گالیاں

جبلتوں کی سطح پر جینا

ہم زندگی کا چھلکا چبا کر جینے والے لوگ ہیں
مغز پھینک دیتے ہیں
اور خوشبو سونگھ کر
وقت ضائع نہیں کرتے
اس لیے ہم
پیٹ سے سوچتے ہیں
اور دانتوں سے محسوس کرتے ہیں

جنت میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں

نوال السعد اوی

ترجمہ: مسعود اشعر

نوال السعد اوی ایک مصری گائنکالوجسٹ اور ادیبہ ہیں۔ انھوں نے کم سن بچیوں کے ختنہ کے باعث، بچیوں کی اموات اور خرابیوں سے متعلق case histories لکھیں۔ انھوں نے عورت کے ساتھ شادی کے نام پر غیر انسانی رشتے کی تہوں کو بے نقاب کیا اور جب یہ لکھ دیا کہ جس مرد نے اس بیوی سے سات بچے پیدا کیے، جس کے بدن اور ہاتھوں کے لمس سے آشنا تک نہیں کیا بلکہ زمین پر دھکا دے کر اپنے غرور کی پیاس بجھائی، تو نوال کو گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔

عرب عورتوں کے مسائل پر نوال السعد اوی کی پہلی کتاب ۱۹۷۲ میں شائع ہوئی تھی۔ مصری حکومت کے ہاتھوں تنگ آ کر آخر انھوں نے اپنی کتابوں کی اشاعت کا مرکز بیروت کو بنالیا۔ ادھر مصری حکومت نے ان کو وزارت صحت کی معتبر نوکری سے برخاست کر دیا۔

لطف اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نوال السعد اوی کے شوہر شیرف ہتاتا، خود ایک ڈاکٹر اور ناول نگار ہیں۔ ڈاکٹر نوال کی بیشتر کتابوں کا انگریزی ترجمہ انھوں نے ہی کیا ہے۔ اس لیے وہ تہذیبی مزاج جس نے مسلم معاشروں کو دقیانوسیت کی تہوں میں لپیٹ رکھتا ہے، وہ اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ ترجمے میں بھی محفوظ ہے۔ (کشور ناہید)

اس نے ہتھیلی سے اپنے نیچے زمین چھونے کی کوشش کی، مگر وہاں مٹی یا زمین تھی ہی نہیں۔ اس نے اوپر دیکھا، گردن آگے کو کر کے روشنی کی طرف نظر کی۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور دبلا پتلا محسوس ہو رہا تھا۔ جلد اتنی سانولی تھی کہ سیاہ معلوم ہوتی تھی۔

وہ اندھیرے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکی اور اس کے ہاتھ میں کوئی آئینہ بھی نہیں تھا، لیکن سفید روشنی اس کے ہاتھ کی پشت پر پڑ رہی تھی، اس لیے وہ ہاتھ بھی سفید ہو گیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ان میں روشنی بھر گئی۔ اس طرح پھیلی ہوئی روشنی سے بھری آنکھیں بالکل حور کی آنکھوں کی

طرح لگ رہی تھیں۔

حیرت زدہ ہو کر اس نے اپنا سر پہلے دائیں جانب گھمایا اور پھر بائیں جانب۔ یہاں سے وہاں تک اس کے سر پر ہرے بھرے درخت سایہ کیے ہوئے تھے اور وہ ٹھنڈے سائے میں بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا جس کا پانی چاندی کی طرح چمک دار تھا اور اس میں موتیوں کی طرح سفید قطرے جمع تھے۔ اس کے سامنے لذیذ کھانوں سے بھری قاب رکھی تھی۔

اس نے پلکیں پوری طرح کھول کر اپنی آنکھوں کو پھیلا دیا، مگر وہ منظر ویسا کا ویسا ہی تھا، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس میں۔ اس نے اپنی عبا کو چھوڑا۔ وہ ریشم کی طرح نرم و ملائم تھی۔ اس کی عبا کے گلے سے مشکل اور بہترین عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔

اس کا سر اور آنکھیں ایک ہی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے پلکیں جھپکیں تو یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا جیسے پہلے غائب ہو گیا تھا۔

لیکن کنکھیوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ ہرا بھرا سایہ دور تک پھیلا ہوا ہے اور سرسبز درخت یہاں سے وہاں تک کھڑے ہیں، جن کی جڑوں میں سے سرخ اینٹوں کا مکان اسے نظر آ رہا ہے۔ وہ مکان کسی محل کی طرح ہے، جس کا زینہ سنگ مرمر کا ہے اور اس کی سیڑھیاں خواب گاہ تک جاتی ہیں۔

وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اسے یقین بھی آ رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔ اسے ایسے خوابوں سے زیادہ اور کسی چیز سے پریشانی نہیں ہوتی تھی جو متواتر آتے تھے اور جن میں وہ دیکھتی تھی کہ وہ مر گئی ہے اور جنت میں ہے۔ ایسے خواب اسے ناممکن لگتے تھے، کیوں کہ اسے موت ناممکن لگتی تھی۔ اور یہ بھی ناممکن لگتا تھا کہ موت کے بعد وہ پھر زندہ ہو جائے گی اور پھر جنت میں جانا تو اس کے لیے بالکل ہی ممکن نہیں تھا۔

اس نے اپنی گردن اور سیدھی کی اور ترچھی نظر کر کے روشنی کو دیکھا۔ منظر ویسا ہی تھا، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ سرخ اینٹوں والا مکان بھی ویسا ہی تھا، جیسے عمدہ (گاؤں کے مکھیا) کا مکان، سیڑھیاں بھی اسی طرح خواب گاہ کی طرف جا رہی تھیں، کمرہ بھی روشنی میں نہا رہا تھا، کھڑکیوں سے دور افق تک نظر آ رہا تھا، ایک بہت بڑی مسہری تھی جس کے چاروں پایوں پر چھپر کھٹ والے چار ڈنڈے کھڑے تھے اور ان پر ریشمی پردے جھول رہے تھے۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔

یہ سب کچھ اتنا حقیقی تھا کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اسی جگہ بیٹھی رہی۔ اسے یقین کرتے ڈر لگ رہا تھا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ مر جائے اور پھر اتنی جلدی زندہ ہو کر جنت میں چلی جائے؟

اسے جس بات پر مکمل یقین نہیں آ رہا تھا، وہ یہ تھی کہ یہ سب اتنی جلدی ہو گیا تھا۔ ٹھیک ہے، موت بہت آسان ہے۔ ہر شخص ہی مرتا ہے اور اس کی موت تو سب سے زیادہ آسان تھی، کیوں کہ وہ پہلے ہی موت اور زندگی کے بیچ لٹکتی رہتی تھی بلکہ موت کے زیادہ قریب رہتی تھی۔ جس ماں نے اسے جنا تھا، وہ اس کے اوپر لیٹی رہی تھی اور وہ اس کے بوجھ سے مر گئی تھی یا پھر اس کے باپ نے ماں کے سر پر کدال مارا تھا جس سے وہ مر گئی تھی۔ ہر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اور بھی بخار ہو جاتا، یہاں تک کہ آٹھ بچے ہو گئے۔ پھر اس کے

شوہر نے اس کے پیٹ میں لات ماری اور پھر سورج کی کرنیں اس کی کھوپڑی کی کرچیوں میں سمٹتی چلی گئیں۔

اس کے لیے زندگی مشکل تھی اور موت آسان۔ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانا اس سے بھی آسان لگتا تھا، کیوں کہ کوئی بھی ایسا نہیں جو مرنے کے بعد پھر نہ اٹھایا گیا ہو۔ ہر شخص مرنے کے بعد پھر اٹھتا ہے۔ صرف جانور ہی ایسے ہیں جو ہمیشہ کے لیے مرجاتے ہیں۔

اس کا جنت میں جانا ناممکن تھا، لیکن اگر وہ جنت میں نہیں جائے گی تو اور کون جائے گا؟ اپنی ساری زندگی میں اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا، جس سے خدا یا اس کے رسول ناراض ہوں۔ وہ اپنے گھنگریالے بالوں میں اونی موباف ڈال کر چوٹی بناتی اور چوٹی کو سفید رومال سے باندھتی، پھر اوپر سے کالی چادر اوڑھتی۔ اس کے جلابیہ میں سے سوائے ایڑیوں کے اور کچھ نظر نہ آتا۔ پیدائش سے موت تک اس نے ایک ہی لفظ سیکھا تھا، ''جی بہت اچھا۔''

سورج نکلنے سے پہلے جب اس کی ماں اسے مار کر اٹھاتی کہ اپلے تھاپنے کے لیے گوبر اٹھا لائے تو اس وقت سے شام تک وہ ''اچھا'' ہی کہتی رہتی۔ اس نے کبھی اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی نہیں دیکھا۔ اسے بخار ہوتا اور اس کے باوجود وہ اپنا جی خوش کرتا، تب بھی وہ جی بہت اچھا ہی کہتی۔

اس نے اپنی زندگی میں کبھی چوری نہیں کی اور نہ کبھی جھوٹ بولا۔ وہ مرتے مرجاتی، مگر کسی اور کھانا نہ چھوتی، چاہے وہ کھانا اس کے باپ یا شوہر کا ہی کیوں نہ ہوتا۔ اس کی ماں روٹیوں پر سالن رکھ کر اور اسے لپیٹ کر اس کے ہاتھ کھیت پر باپ کے لیے بھیجتی۔ وہ اپنے سر پر رکھ کر کھانا لے جاتی۔ بعد میں اس کے شوہر کی ماں بھی اسی طرح اپنے بیٹے کے لیے اس کے ہاتھ کھیت پر کھانا بھیجتی۔ اس کا دل بہت للچاتا۔ اس کے جی میں آتا کہ وہ راستے میں کسی پیڑ کے سائے میں بیٹھ جائے اور پوٹلی کھول کر دیکھے، لیکن وہ کبھی ایسا نہیں کرسکی، جب بھی اس کے دل میں ایسا خیال آتا، وہ فوراً خدا سے دعا مانگتی کہ اے اللہ! مجھے شیطان سے اپنی پناہ میں رکھ۔ راستے میں جب بھوک برداشت سے باہر ہو جاتی تو وہ سڑک کے کنارے سے نرم نرم گھاس اکھیڑتی اور اسے چبانے لگتی۔ پھر نہر کے کنارے بیٹھ کے چلو میں پانی لیتی اور اسے حلق سے نیچے اتار لیتی۔ وہ اس وقت تک پانی پیتی رہتی، جب تک اس کی پیاس نہ بجھ جاتی۔ پھر وہ جلابیہ کی آستین سے منھ پونچھتی اور منھ ہی منھ میں کہتی الحمدللہ، وہ تین بار الحمدللہ کہتی اور چل دیتی۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔ وہ بخار میں پھنک رہی ہوتی اور اس کا خون آگ کی طرح اس کی رگوں میں پھر رہا ہوتا، اس وقت بھی وہ خدا کا شکر ادا کرتی۔ وہ رمضان میں پورے روزے رکھتی، کھانا پکانے کے دن کھانا پکاتی، فصل کی کٹائی پر وہ کھیت کاٹتی، متبرک دنوں میں وہ ماتمی پوشاک پہنتی اور قبرستان جاتی۔

اس نے کبھی اپنے باپ، بھائی یا شوہر کے سامنے غصہ نہیں کیا۔ اگر اس کا شوہر اسے مار مار کر ادھموا کر دیتا تو وہ اپنے گھر چلی جاتی، لیکن اس کا باپ اسے پھر واپس بھیج دیتا۔ اگر وہ اس کے بعد بھی میکے آتی تو اس کا باپ اسے خوب مارتا اور سسرال بھیج دیتا۔ اس کا شوہر اگر اسے پھر مارتا تو وہ روتی ہوئی اپنی ماں کے پاس جاتی اور اس کی ماں اسے سمجھاتی، ''زینب! واپس چلی جا، آخرت میں تو سیدھی جنت میں جائے گی۔''

پیدا ہوتے ہی اس نے اپنی ماں سے بار بار جنت کا لفظ سنا تھا۔ اپنے ہوش میں پہلی بار جب اس نے یہ لفظ سنا، اس وقت وہ چلچلاتی دھوپ میں سر پر گوبر کی ٹوکری رکھے گھر آ رہی تھی۔ تپتی زمین پر اس کے ننگے پاؤں جل رہے تھے۔ اس کے دماغ میں جنت کی جو تصویر آئی، وہ ایسے گھنے سائے والی جگہ کی تھی۔ اس کے سر پر گوبر کی ٹوکری نہیں تھی اور اس کے پیروں میں پڑوسی لڑکے حسنین کی طرح جوتے تھے۔ وہ زمین پر اچھل اچھل کر چل رہی تھی۔ حسنین کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا اور وہ دونوں گھنے سائے میں بیٹھے تھے۔

اسے حسنین کا خیال آیا تو جنت میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھنے سے زیادہ اس کا تصور اسے اور آگے نہیں لے گیا۔ لیکن اس کی ماں اسے ڈانٹتی تھی اور کہتی تھی کہ حسنین یا ہمسایہ کا کوئی بھی لڑکا جنت میں اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔ اپنے شوہر کے سوا اور کسی پر عورت کو نظر نہیں ڈالنا چاہیے۔ مرنے کے بعد شوہر ہی اپنی بیوی کے ساتھ ہوگا۔ اگر سوتے یا جاگتے میں اس کے دل میں شیطانی خیالات آئیں اور اس نے کسی اور مرد کے بارے میں سوچا تو وہ کبھی جنت کا منھ نہیں دیکھے گی۔

اس کے بعد سے جب بھی وہ سونے لیٹتی، ہمیشہ اپنے شوہر کو ہی دیکھتی۔ وہ دیکھتی کہ جنت میں اس کا شوہر اسے مارتا پیٹتا نہیں، اس کے سر پر گوبر کا ٹوکرا نہیں ہے، اور اس کے ننگے پاؤں ریت میں نہیں جل رہے ہیں۔ اس کا مٹی کا جھونپڑا سرخ اینٹوں والا بڑا مکان بن گیا ہے۔ مکان کے اندر بہت بڑا زینہ ہے۔ ایک بہت لمبی چوڑی مسہری پر پڑی ہے جس پر اس کا شوہر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے لیٹا ہے۔

جنت میں اپنے میاں کا ہاتھ پکڑنے سے آگے اس کا خیال نہیں جاتا تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے کبھی اپنے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اس شوہر سے اس کے آٹھ بیٹے بیٹیاں تھیں لیکن وہ سب میاں کا ہاتھ پکڑے بغیر ہی اس کی کوکھ میں داخل ہوئے تھے۔ گرمیوں میں وہ کھیت میں سوتا اور سردیوں میں کھلیان میں یا پھر انگیٹھی کے اوپر سوتا۔ ساری رات وہ چت سوتا، ایک بار بھی کروٹ نہ لیتا۔ جب وہ کروٹ لیتا تو گیدڑ کی آواز میں اسے بلاتا۔ اور ابھی وہ ''جی'' بھی نہ کہتی کہ وہ اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیتا اور اس پر سوار ہو جاتا۔ اگر وہ کوئی آواز نکالتی یا لمبا سانس لیتی تو وہ اس کے ٹھوکر مارتا۔ اگر وہ آواز نہ نکالتی، تب بھی اس کے ٹھوکریں پڑنا شروع ہو جاتیں۔ یہاں تک کہ وہ لمبے سانس لینا شروع کر دیتی۔ شوہر کے ہاتھ نے کبھی اس کا ہاتھ نہیں تھاما اور نہ کبھی اس کے بازوؤں نے اسے اپنی گرفت میں لیا۔

اس نے صرف فاختاؤں کو ایک دوسرے سے ملتے دیکھا تھا۔ کبھی کسی انسانی جوڑے کو بغلگیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ دیوار پر چڑھتی تو اسے فاختائیں ایک دوسرے کے ساتھ چونچ ملاتی نظر آتیں۔ یا وہ جانوروں کے باڑے میں جاتی تو گائے اور بیل اس طرح دکھائی دیتے، لیکن ایسے وقت اس کی ماں لاٹھی سے انھیں مارتی اور برا بھلا سناتی۔

ساری عمر اس نے اپنے سر سے کالی چادر نہیں اتاری تھی اور نہ وہ سفید رومال اتارا تھا، جس سے اس کے بال بندھے رہتے تھے۔ البتہ کہیں موت ہو جاتی تو وہ اتارتی۔ اس کا شوہر مرا تو اس نے کالی چادر سر پر باندھ لی اور تین برس تک ماتمی پوشاک پہنے رہی۔ ایک آدمی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بچے رکھنا

نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ماں نے غصے میں تھوک دیا اور اپنی چادر کو سر پر کھینچ کر بڑبڑائی، ''بے شرم کہیں کا، کوئی عورت شادی کے لیے اپنے بچے چھوڑ سکتی ہے؟'' تین برس گذر گئے۔ پھر ایک آدمی بچوں کے ساتھ اس سے شادی کرنے پر رضامند ہوگیا۔ اب اس کی ماں نے فیل مچائے، ''دنیا میں عورت کو اور کیا چاہیے، ماشاءاللہ بچے ہیں، شوہر مر چکا ہے تو کیا ہوا؟''

ایک دن اس کا جی چاہا تھا کہ کالی چادر اتار دے اور سفید رومال ہی سر پر رکھے، مگر پھر خیال آیا کہ لوگ کیا کہیں گے، یہی کہ اپنے شوہر کو بھول گئی۔ اس لیے اس نے کالی چادر اپنے سر سے ہی باندھے رکھی اور جب تک مر نہ گئی، اسی طرح ماتمی پوشاک پہنے رہی۔

اب اس نے دیکھا کہ وہ تابوت کے اندر ہے اور ریشمی کفن میں لپٹی ہوئی ہے۔ جنازہ کے ساتھ جانے والوں میں اس نے اپنی ماں کے بین کرنے کی آواز سنی جیسے گیدڑ رو رہے ہوں یا ریل گاڑی سیٹی بجا رہی ہو۔ ''زینب! جنت میں تو اپنے میاں کے پاس جا رہی ہے۔''

پھر شور بند ہوگیا۔ اب وہ صرف خاموشی کی سانسیں سن رہی تھی اور اسے مٹی کے سوا کوئی اور خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ اس کے نیچے کی زمین پر ریشم کی طرح ملائم تھی۔ اس نے سوچا یہ کفن ہے۔ اپنے سر پر اس نے دو غصیلی آوازیں سنیں جیسے دو آدمی جھگڑ رہے ہوں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پر لڑ رہے ہیں۔ پھر اس نے سنا کہ ایک آواز نے اس کا نام لیا اور کہا کہ اسے قبر کے عذاب سہے بغیر ہی سیدھا جنت میں جانا چاہیے۔ مگر دوسری آواز نہیں مانتی تھی۔ وہ ضد کر رہی تھی کہ اسے قبر کا عذاب ضرور ملنا چاہیے، وہ سیدھی جنت نہیں جا سکتی۔ ہر شخص کے لیے قبر کا عذاب ضروری ہے۔ اس پر پہلی آواز نے پھر اصرار کیا کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا، جس کا اسے عذاب دیا جائے، وہ ہمیشہ اپنے شوہر کی وفادار رہی۔ دوسری آواز نے دلیل پیش کی کہ سفید رومال کے اندر سے اس کے بال نظر آتے تھے اور اس نے مہندی سے اپنے بال لال کیے تھے اور اس کی مہندی لگی ایڑی اس کے جلابیہ میں سے دکھائی دیتی تھی۔

پہلی آواز نے جواب دیا کہ اس کے بال کبھی نظر نہیں آئے، تم نے جو دیکھا وہ موباف تھا۔ اس کا جلابیہ تو بہت لمبا اور کھلا ہوتا تھا۔ وہ موٹے کپڑے کا ہوتا تھا اور اس کے اندر وہ بہت ہی موٹی قمیص پہنتی تھی اور لمبا پاجامہ بھی پہنتی تھی۔ آج تک کسی نے اس کی لال ایڑی نہیں دیکھی۔

لیکن اس آواز کا ساتھی مستقل کہتا رہا کہ اس کی لال ایڑی سے گاؤں والوں کا دل خراب ہوتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان یہ جھگڑا ساری رات چلا۔ وہ ایسے ہی لیٹی رہی۔ اس نے اپنی ناک اور منھ نیچے کر رکھا تھا۔ وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ مر گئی ہے۔ اگر یہ پتہ چل گیا کہ وہ مری نہیں ہے تو قبر کا عذاب اور بھی لمبا ہو جائے گا۔ موت ہی اسے اس عذاب سے بچا سکتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کس بات پر اتفاق ہوا؟ اس کا اسے علم نہیں ہو سکا۔ انسان ہو یا روح مرنے کے بعد قبر میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کا کسی کو پتہ تھوڑا ہی چلتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی بات سن بھی لے تو اسے ظاہر یہی کرنا چاہیے کہ اس نے کچھ نہیں سنا اور نہ کچھ سمجھا۔ سمجھنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ دونوں جھگڑا کرنے والے منکر نکیر یا کسی قسم کے فرشتے بھی نہیں ہیں، کیوں کہ اگر وہ فرشتے ہوتے

تو اتنی سی بات بھی نہ جانتے جو سارا گاؤں جانتا تھا کہ اس نے عمدہ کی بیٹیوں کی طرح اپنے پیروں میں کبھی مہندی نہیں لگائی بلکہ اس کا منھ اور ہتھیلیاں تو کالی مٹی کی طرح ہمیشہ پھٹی رہتی تھیں۔

ان دونوں آوازوں کا جھگڑا صبح ہونے سے پہلے ختم ہوگیا اور اسے عذاب سے گذرنا نہیں پڑا۔ وہ آوازیں بند ہوئیں تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اسے اپنا جسم ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا اور وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ وہ جیسے آسمان میں اڑتی رہی، پھر اس کا جسم نیچے اترا اور وہ نرم اور مرطوب مٹی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، 'ہاں یہ جنت ہے۔'

ڈرتے ڈرتے اس نے سر اٹھایا تو سامنے دور تک نخلستان تھا۔ اونچے اونچے سایہ دار درخت تھے اور ان کے نیچے خوب گھنا سایہ۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ درخت اس کے قریب تک پھیلتے چلے آ رہے ہیں۔ مہکتی ہوئی تازہ ہوا اس کے نتھنوں سے ہوتی اس کے سینے میں بھر گئی ہے اور مٹی، دھول اور گوبر کی ساری بدبو اس کے بدن سے نکل گئی ہے۔

وہ ہولے سے اٹھی اور کھڑی ہوگئی۔ سامنے درختوں کے جھنڈ میں اسے سرخ اینٹوں کا محل نظر آ رہا تھا، محل کا دروازہ اس کے سامنے تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی اس کے اندر داخل ہوگئی۔ اسی طرح ہانپتی وہ اونچا زینہ چڑھ گئی۔ خواب گاہ کے باہر، وہ ایک پل کے لیے ٹھہری، اس نے اپنی سانسیں درست کیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

دروازہ بند تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے بڑھایا اور کواڑ کو ہلکا سا دھکا دیا۔ سامنے مسہری کے چاروں پایوں پر چار چوب کھڑے تھے، جن پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ اس نے دیکھا، مسہری پر اس کا شوہر دولھا بنا بیٹھا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ دونوں عورتوں نے ایسے شفاف لباس پہن رکھے ہیں کہ ان کے اندر سے ان کا گورا گورا بدن جھلک رہا ہے۔ ان کی آنکھیں ایسی روشن ہیں جیسے حوروں کی آنکھیں۔ اس کے شوہر کا چہرہ اس کی جانب نہیں تھا، اس لیے شوہر نے اسے نہیں دیکھا۔ ابھی تک اس کا ہاتھ دروازہ پر تھا۔ اس نے کواڑ اپنی طرف کھینچا اور اسے بند کر دیا۔ پھر وہ زمین پر اتر آئی، ہاں اس جیسی عورت کے لیے جنت میں بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

[''آخری مرد کی موت''، نوال السعداوی، مشعل، لاہور]

اس نے کہا، میں نے مان لیا۔ اس نے زور دے کر کہا، مجھے شک ہوا۔
اس نے قسم اٹھائی، مجھے یقین ہوگیا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔
خلیل جبران

دانشوراور سماجی تبدیلی (چند ابتدائی باتیں)

ناصر عباس نیر

زیر نظر شمارہ ترتیب پا چکا تھا، حتیٰ کہ میں اداریہ تک لکھ چکا تھا کہ اچانک میری نظر ناصر عباس نیر کے اس مضمون پہ پڑی، اور 'میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔' 'اثبات' کے اس دوسرے دور کے جس موقف کو اجمالاً میں نے اپنے اداریہ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے، وہ شرح وبسط کے ساتھ اس مضمون میں موجود ہے۔لہٰذا، قارئین سے درخواست ہے کہ وہ زیر نظر مضمون کو ضرور پڑھیں، کیوں کہ 'اثبات' کا آئندہ سفر انھی خطوط پر گامزن ہوگا۔

دانشور کون؟

سماج کی تعمیر، تعمیر نو یا سماج میں کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے میں دانشور کا کیا کردار ہے؟اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے دو سوالات پر توجہ ضروری ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کب سے یہ سمجھا جانے لگا کہ سماج کی اصلاح وتعمیر میں دانشور کا بھی کوئی کردار ہوتا ہے؟ کیا انسانی معاشرے کی ابتدائی تشکیل کے دنوں ہی میں یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ سماجی تشکیل کے عمل میں اس خاص گروہ کا حصہ تھا، جو ذہنی کام کرتا ہے، یا تاریخ کے کسی خاص عہد میں دانشور کی اہمیت کا ادراک ہوا؟ ابتدائی معاشروں میں طاقت کے دو مراکز تھے، جو معاشرے کی تشکیل اور کارکردگی پر اثر انداز ہوتے تھے؛ بادشاہ اور کاہن، پروہت، جادوگر، مذہبی راہنما۔ کاہنوں اور جادوگروں کا طبقہ، بادشاہ کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور تھا۔ بادشاہ کے پاس عسکری طاقت ہوا کرتی تھی، جب کہ کاہن، جادوگر وغیرہ 'علم کی طاقت' کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ یہ 'علم' انسانی کوشش کا نتیجہ نہیں، دیوتاؤں کی عطا سمجھا جاتا تھا۔اس 'علم' کی 'طاقت' لوگوں کے عقیدے اور یقین میں مضمر تھی۔ بیماری، جنگ، غربت، سفر، موت جیسے مصائب کا سامنا کرنے میں اس 'علم' سے مدد لی جاتی تھی۔ بہر کیف، قدیم انسانی معاشروں میں جادوگروں اور مذہبی راہنماؤں نے اس یقین کو عام کیا کہ علم، سماج کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔لیکن جسے ہم دانشور کہتے ہیں (جس کی وضاحت آگے آرہی ہے)، وہ ایک نیا طبقہ ہے، جس کا وجود جدید کاری کا مرہون ہے۔ اگرچہ قدیم زمانوں کے کاہنوں اور جدید عہد کے دانش وروں میں یہ بات

مشترک ہے کہ دونوں 'ذہن وشعور ودانش' کی مدد سے معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، مگر 'ذہن وشعور ودانش' کی تعریف، تخلیق اور ترسیل کے طریقوں میں اس قدر فرق ہے کہ ان کے سماج پر اثرات کی نوعیت میں بنیادی قسم کا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں قدیم زمانے کے کاہنوں اور جدید زمانے کے دانشوروں کے بیچ 'حکیم، عارف، صوفی، دانا، ملا، علامہ' اور 'فلاسفر، wizard,geniussavant, sage' وغیرہ تھے۔ان کا تعلق کلاسیکی عہد سے تھا۔ان میں دو طرح کے لوگ تھے: روایتی اور انقلابی۔ ملا روایتی صاحب علم تھا؛ وہ ماضی کی روایات کی سختی سے پاس داری کرتا تھا، جب کہ صوفی وحکیم بڑی حد تک انقلابی تھے؛ خود طریقت ایک انقلابی راستہ تھا، جسے صوفیا نے وضع کیا؛ مذہبی رواداری، صوفیانہ دانش کا دوسرا انقلابی پہلو تھا؛ صوفیا کا کلاسیکی اشرافی زبانوں کی جگہ مقامی عوامی زبانوں میں اظہار کرنا، ایک اور انقلابی دانشورانہ خیال تھا۔ دوسری طرف حکما و فلاسفہ، سماج کا وہ مختصر گروہ ہوا کرتے تھے، جو زندگی، دنیا اور کائنات سے متعلق بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرتے تھے؛ یعنی مذہبی وجدان کے ساتھ ساتھ، یا اس کی جگہ انسانی تعقل کو بروئے کار لاتے تھے۔اسی گروہ نے پہلی مرتبہ باور کرایا کہ علم دیوتاؤں کی عطا نہیں، انسانی کوشش کا نتیجہ ہے۔نوراللغات میں حکمت کی تعریف کے ضمن میں لکھا ہے کہ ''اصطلاح میں حکمت عبارت ہے، احوال موجودات کے علم سے جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہے''(۱)۔موضوع کے اعتبار سے حکمت کی تین شاخیں بیان کی گئی ہیں: طبعی، ریاضی اور الٰہی۔ پھر حکمت کو نظری اور عملی میں بانٹا گیا ہے۔لہٰذا حکیم وہ شخص ہوا کرتا تھا، جو موجودات سے متعلق نظریات وضع کرتا تھا، اور وجود حقیقی کے اثبات، اور انسانی دنیا وکائنات میں اس کی قدرت واختیار کی وسعت سے متعلق تجریدی تصورات پیش کیا کرتا تھا۔اس کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ طبیعی و مابعد الطبیعی فکر کی تشکیل میں بیک وقت سرگرم ہوا کرتا تھا۔ جدید دانشور سے فقط اس مفہوم میں مختلف تھا کہ وہ علم کی سماجی افادیت سے سروکار نہیں رکھتا تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دانشور ہے کون؟ وہ کن خصوصیات کی بنا پر سماج کے باقی لوگوں سے مختلف ہے، اور الگ پہچانا جاتا ہے؟ نیز وہ جن خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، انھیں وہ کیوں کر حاصل کرتا ہے؟ کیا یہ خصوصیات فطری ہوتی ہیں، یا اکتسابی؟ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ دانشور کا لفظ ہمارے یہاں انگریزی لفظ انٹلکچوئل کے معنی میں اور مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق انٹلکچوئل سے مراد وہ شخص ہے جو intellect یعنی 'منطقی انداز میں سوچنے کی صلاحیت' کو استعمال میں لاتا ہے(۲)۔ منطقی انداز میں سوچنا، تاثر وجذبے پر منظّم ومرتب غور وفکر کو ترجیح دینا ہے، تاکہ کسی شے یا کسی مسئلے کا صحیح، معروضی علم حاصل کیا جاسکے۔اسی لیے سنجیدہ مطالعہ اور مسلسل غور وفکر دانشور کی پہچان ہے۔ دانشور رفتہ رفتہ ایک 'نئی دنیا' میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ذہنی، عقلی، استدلالی دنیا ہے؛ شعور کی دنیا ہے؛ مسلسل جاننے، تحقیق کرنے، اور شعور کی حدوں کو وسیع کرنے کی دنیا ہے؛ پرانی اصطلاح میں منقولات کی بجائے معقولات کی دنیا ہے؛ وجدان والہام واساطیر کے بجائے، تعقل کی دنیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دانشور کی دنیا انسانی علم کی دنیا ہے؛ انسانی علم سے مراد، وہ علم جسے انسان نے، انسانی معاملات و مسائل پر، خالص انسانی ذہنی وسائل کو بروئے کار لاتے

ہوئے،غوروفکراورتحقیق کی مدد سے تخلیق کیا ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ دانشوروں کے طبقے کا ظہور جدید عہد میں ہوا۔جدیدیت کا انسانیت پر غالباً احسان عظیم یہ ہے کہ اس نے باور کرایا کہ خیالات اور علم کی تخلیق ایک خالص انسانی سرگرمی ہے؛علم کا سرچشمہ انسانی ذہن ہے۔تمام سماجی علوم اس یقین کی کوکھ سے پیدا ہوئے،اوراساطیر ومذاہب کے معاشرتی مطالعات کی راہ کھلی۔مغرب میں جدید عہد کا آغاز چودھویں صدی کے لگ بھگ ہوا،تاہم جدیدیت کا یہ داعیہ ’علم کا سرچشمہ ذہنِ انسانی ہے‘ ہمیں بعض مسلم مفکرین کے یہاں ملتا ہے۔مثلاً ابوبکر رازی نے کہا کہ ’’انسان کو راستہ دکھانے اوراس کے اندر روشن خیالی پیدا کرنے کے لیے عقل ہی کافی ہے‘‘(۳)۔اسی طرح ابوالعلامعری نے کہا ’’کہ عقل کے سوا کوئی امام نہیں جوانسان کی صبح شام راہنمائی کرے۔[اپنے اشعار میں کہا کہ] میں حیران ہوں کسریٰ کے حواریوں پراوراس ریت پر کہ انسانوں کے منھ گائے کے پیشاب سے دھوئے جائیں اور یہودیوں کی اس بات پر کہ خدا کو (قربانی کے) لہو کے چھینٹے اور بھنے ہوئے گوشت کی باس پسند ہے،اورعیسائیت کے اس عقیدے پر کہ خدا پر سچ مچ ظلم و جبر ہوا تھا،اوروہ اس سے بچنے کے لیے کچھ بھی نہ کرسکا،اوران لوگوں پر جو کنکریاں مارنے اور پتھر کو بوسہ دینے کے لیے دور دراز کا سفر کر کے آتے ہیں۔کوئی حیرت جیسی حیرت ہے لوگوں کی ان باتوں پر! کیا ان میں سے کسی کو بھی حقیقت کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا‘‘(۴)۔گویا معری کا خیال تھا کہ ’حقیقت کا چہرہ‘ انسانی عقل دیکھ سکنے کی اہل ہے۔اس کے علاوہ معری کی دانشورانہ فکراس نازک نکتے کو بھی گرفت میں لیتی ہے کہ عقل کی امامت کی راہ میں مذہبی رسمیات حائل ہیں۔مذہبی وسیکولر بہ معنی انسانی فکر میں تضاد کا احساس ان مسلمان حکما کو تھا،مگر مسلم معاشروں کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ ابوبکر رازی،معری اور ابن رشد کی عقلیت پسندانہ آوازوں پر غزالی،ابن حزم اور فخرالدین رازی کی عقلیت مخالف آوازیں غالب آگئیں،اور یہاں سماجی سائنسوں کی روایت پیدا نہ ہوسکی۔

انٹلکچوئل کی اصطلاح کا موجودہ رواج فرانس میں ’’دانشوروں کے منشور‘‘ سے ہوا۔قصہ یہ تھا کہ ۱۸۹۴ میں فرانسیسی فوجی الفریڈ ڈریفس (جو مذہباً یہودی تھا) پر یہ الزام عائد ہوا کہ اس نے جرمنوں کو فرانس کے عسکری راز فراہم کیے۔فوجی عدالت نے اسے مجرم قرار دے کر سزا دی۔اس واقعے نے فرانس کے اہل دانش کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا،جنھوں نے ’’دانشوروں کا منشور‘‘ تیار کیا۔اس میں ایملی زولا پیش پیش تھے۔اس منشور پر ہر طبقہ فکر کے لوگوں کے دستخط حاصل کرنے کی مہم چلائی گئی۔جن ادیبوں نے اس منشور سے اتفاق کیا،ان میں مارسل پروست اور موپاساں بھی شامل تھے۔ان اہل دانش کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ فرانسیسی حکومت کے سامی مخالف رویوں،عسکری ناانصافی اور قومی جوش کے خلاف جرأت سے بولنے کا فیصلہ کریں،یا بزدل بن جائیں،اور ہجوم کا ساتھ دیں،یعنی یہودی الفریڈ ڈریفس کے دفاع سے انکار کردیں،اور جرمنوں کے خلاف جنگجویانہ ترانے گائیں۔جدید دنیا کی تاریخ میں یہ غالباً پہلی مرتبہ تھا کہ دانشور ایک ’نئے سماجی گروہ‘ کی صورت میں منظّم ہوئے،اور انھوں نے ریاستی وسماجی معاملات میں ایک واضح،دوٹوک مؤقف اختیار کیا؛ایک ایسا مؤقف جو مقبول عام،نام نہاد قومی مؤقف کے برعکس تھا۔ڈریفس

کے معاملے نے،دانشور کے سلسلے میں کئی سنجیدہ سوالات کو بھی جنم دیا۔مثلاً یہ کہ مصنفین اور جامعات کے اساتذہ یعنی دانشور جس اعلیٰ بصیرت کا دعویٰ کررہے ہیں،کیا وہ ملکی قانون سے برتر ہے؟ نیز دانشوروں کو ریاستی وملکی اداروں کے معاملات میں مداخلت کا حق کیوں کر ہوسکتا ہے؟ دانشور قومی فیصلوں پر سوال اٹھانے کا جواز کہاں سے حاصل کرتا ہے؟ کیا یہ جواز اسے محض اپنی ادبی وعلمی شہرت سے حاصل ہوجاتا ہے یا ادب تخلیق کرنے اور کسی شعبۂ علم میں مسلسل کام کرنے کے نتیجے میں اسے ’دانشورانہ بصیرت‘ کا تحفہ ملتا ہے؟ بیسویں صدی میں دانش ور کی شناخت اوراس کے سماجی کردار کی تشکیل انھی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی مرہون نظر آتی ہے۔

دانشور یعنی انٹلکچوئل کو بعض لوگ انٹیلیجنسیا (Intellegentsia) یعنی ’اعلیٰ تعلیم یافتہ‘ کا مترادف سمجھتے ہیں۔حالاں کہ دونوں میں فرق ہے۔’’یہ [انٹیلیجنسیا] اصطلاح پہلی مرتبہ روس میں انیسویں صدی میں استعمال ہوئی،جس سے مراد وہ ثقافتی طبقات تھے،جنھوں نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی تھی،اوروہ پیشہ ورانہ ملازمت کے اہل تھے۔یہ وہ لوگ تھے،جو دستکارانہ پیشوں کے مقابلے میں ذہنی پیشوں سے منسلک تھے‘‘(۵)۔اس کے مقابلے میں دانشور (انٹلکچوئل) وہ گروہ ہے جو سماج اور ثقافت کے عمومی سوالات سے دلچسپی رکھتا ہے،نیز جو خیالات کی تخلیق،ترسیل اور تنقید میں براہ راست حصہ لیتا ہے‘‘(۶)۔گویا دونوں میں دو قسم کے فرق ہیں۔دانشور علم کی تخلیق میں حصہ لیتا ہے،جب کہ ’اعلیٰ تعلیم یافتہ‘ لوگ کسی علم یا فن پر عبور حاصل کرتا ہے۔دوسرا فرق یہ ہے کہ دانشور کی وابستگی عوام سے ہوتی ہے،مگر تعلیم یافتہ گروہ کا تعلق سماج کے کسی خاص مگر محدود طبقے سے ہوتا ہے۔دونوں کی وابستگیوں کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔دانشور کی وابستگی بے غرضانہ ہوتی ہے،جب کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ کی وابستگی کی نوعیت پیشہ ورانہ ہوتی ہے۔اس لحاظ سے دیکھیں تو ڈاکٹر،انجینئر،منیجر،اعلیٰ انتظامی افسر ’’انٹیلیجنسیا‘‘ ہیں،جب کہ ادیب،سائنس دان،فلسفی،مذہبی مفکر،استاد،سیاسی و عمرانی مفکرین دانشور ہیں۔

دانشور کا تصور اس وقت تک پوری طرح واضح نہیں ہوسکتا،جب تک اس سوال کا جواب نہ دیا جائے (جس کا سامنا فرانسیسی دانش وروں کو اول اول کرنا پڑا تھا) کہ ’ادیب،سائنس دان،فلسفی،استاد،مذہبی وسیاسی مفکر‘ کس بنیاد پر دانشور کہلاتے ہیں؟ کیا دانشوری ان کی بنیادی خصوصیت ہے یا اضافی خوبی ہے؟ یعنی کیا وہ ’ادب،سائنس،فلسفے اور فکر‘ کی صورت میں جو کچھ تخلیق کرتے ہیں،اسی کا دوسرا نام دانش ہے،یا پھر ان شعبوں میں کام کرنے کے نتیجے میں وہ دنیا،انسان اور کائنات سے متعلق ایک ایسی ’نظر‘ حاصل کرتے ہیں جو مسائل کے دانش ورانہ تجزیے میں مدد دے سکتی ہے؟ ان سوالوں کے جواب آسان نہیں ہیں۔بڑی دقت تو یہ ہے کہ ادب،سائنس،فلسفے اور فکر کو ہم ایک ہی زمرے میں نہیں رکھ سکتے۔ان شعبوں میں کام کرنے والے لوگ مختلف انداز میں کام کرتے ہیں؛ان کا بنیادی مواد مختلف ہوتا ہے،اس مواد کو ترتیب دینے اور نتائج اخذ کرنے،نہ کرنے کے طریق ہائے کار مختلف ہوتے ہیں۔مثلاً ادب اصل میں ایک تخیلی تشکیل ہے،جب کہ فلسفہ وسائنس منطق ومشاہدے سے متعلق ہیں۔مذہبی مفکر مابعدالطبیعیاتی دنیا کو بنیادی حوالہ بناتا ہے،اور

سیاسی وعمرانی مفکر جس دنیا سے مواد حاصل کرتا ہے، یا جس دنیا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، وہ مادی، سماجی دنیا ہے۔ ہر چند یہ سب لوگ کسی نہ کسی سطح پر سماجی دنیا پر بحث کرتے ہیں، یا اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، مگر براہ راست رجوع کرنے، اور بالواسطہ حوالہ بنانے میں، اور بنیادی دلیل مابعدالطبیعی دنیا سے یا حسی دنیا سے لانے میں بہت فرق ہے۔ یہی دیکھیے کہ جب ادب مادی سماجی دنیا کی تخیلی تشکیل کرتا ہے تو اس سے اس دنیا کے مسائل ومعاملات کی ترجمانی، اس کی عمرانی ترجمانی سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں 'ادب، سائنس، فلسفہ، فکر' دنیا کی تفہیم وترجمانی کے الگ الگ طریقے ہیں۔ سائنس دان اور مذہبی وعمرانی مفکر اپنی بنیادی حیثیت میں دانش کی تخلیق نہیں کرتے، تاہم وہ ہمیں دنیا وسماج کی آگاہی دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی آگاہی کو 'دانشورانہ آگاہی' نہیں کہہ سکتے۔ اگر آگاہی ہمارے شعور کو وسیع کرتی ہے تو دانشورانہ آگاہی شعور میں وسعت کے علاوہ گہرائی بھی پیدا کرتی ہے؛ وہ ہمارے شعور واحساس کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف ادب وفلسفہ میں دانشورانہ آگاہی کے بیش از بیش عناصر ہوتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ 'ادب، سائنس، فلسفہ اور فکر' میں مسلسل اور تخلیقی انداز میں کام کرنے والے ایک ایسی نظریا طریق کار وضع کرنے میں عموماً کامیاب ہوتے ہیں، جو مسائل پر دانشورانہ رائے ظاہر کرنے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ اس کا اظہار اکثر اس وقت ہوتا ہے، جب ان لوگوں کو کسی انتہائی اہم اجتماعی مسئلے پر ایک واضح مؤقف کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ یہیں ہمیں انفرادی دانشورانہ مؤقف، اجتماعی دانش ورانہ مؤقف، منقسم اجتماعی دانش ورانہ اور اجتماعی عوامی مؤقف میں فرق کرنا چاہیے۔ سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی، یہ ان کا انفرادی مؤقف تھا۔ اسی زمانے کے دو اہم دانشوروں اکبر اور شبلی نے انڈین نیشنل کانگریس ہی کی حمایت کی۔ یہ ایک ہی مسئلے کے ضمن میں مختلف دانشوروں کے مختلف انفرادی مؤقف تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں ترقی پسندوں نے برطانیہ کی حمایت کی؛ یہ اجتماعی دانش ورانہ مؤقف کی مثال تھی۔

قیام پاکستان کے بعد کشمیر پر بھارت کے حملے کی مذمتی قرارداد پر محمد حسن عسکری نے ادیبوں کے دستخط حاصل کرنے شروع کیے۔ اس پر سوائے فیض کے کسی ترقی پسند نے دستخط نہیں کیے۔ یہ منقسم اجتماعی دانشورانہ مؤقف تھا۔ چند دن پہلے پشاور میں آرمی پبلک سکول میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ بچوں کے وحشیانہ قتل کے بعد طالبان کے خلاف اجتماعی عوامی مؤقف سامنے آیا۔

اسی مقام پر ایک ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ ادب، سائنس، فلسفہ وفکر کے شعبوں سے متعلق سب لوگوں میں 'دانشورانہ نظر' پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو خیالات تخلیق کرتا ہے، جب کہ ایک بڑا طبقہ ایسا ہوتا ہے جو دوسروں کے تخلیق کیے ہوئے خیالات کی تفہیم وترسیل کا انتخاب کرتا ہے۔ دوسرے طبقے کے یہاں ہمیں ایک دوئی ملتی ہے۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جس علم، یا جن نظریات، یا جن تخیلات کو پیش کرتے ہیں، سماجی زندگی میں اس کے برعکس مؤقف کے حامل ہوتے ہیں۔ فزکس کا استاد، مذہب میں شدت پسندانہ خیالات کا حامل ہوسکتا ہے؛ فلسفے کا مؤرخ، ثقافتی تعصّبات کا مظاہرہ کرسکتا ہے، اور ایک شاعر فرقہ وارانہ خیالات کی حمایت کرسکتا ہے۔ خدا اور آخرت کی سزا وجزا میں غیر

متزلزل یقین رکھنے والا، بے گناہ لوگوں کے گلے کاٹتا ہے۔ لہٰذا ادب، سائنس، فلسفے اور فکر سے محض تعلق کسی کو دانشور نہیں بناتا۔ دانشوری مسلسل سوال اٹھانے، ہر صورت حال کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر نظر ڈالنے، ہر مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرنے، مقبول آرا پر سوالیہ نشان لگانے، اور سب سے بڑھ کر ہر نئے مسئلے کو اس کے اپنے تناظر میں سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ دانشوری کے لیے سب سے بڑا خطرہ آدمی کے بچپن کے تصورات، اور ماضی وتاریخ کو مطلق صداقتوں کا درجہ دینے میں ہے۔

خلط مبحث سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس نکتے کو پیش نظر رکھیں کہ چونکہ ہم ادب اور سائنس وفلسفہ وفکر کو ایک ہی زمرے میں شمار نہیں کرسکتے، اس لیے ان سب میں دانشوری کا اظہار یکساں انداز میں نہیں ہوتا۔ نیز یہ بات بھی نظر میں رہنی چاہیے کہ دانشوری کا گہرا تعلق ترجمانی کے اسلوب سے ہے۔ دانشوری راست، غیر مبہم ترجمانی کا تقاضا کرتی ہے۔ سائنسی، فلسفیانہ، فکری مضامین میں دانشورانہ باتیں غیر مبہم پیرائے میں ظاہر ہوتی ہیں، مگر ادب میں نہیں۔ تخلیق کار کا انداز تخیلی اور تاثراتی ہوتا ہے، وہ معلوم دنیا کو بھی نامانوس اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ صاف لفظوں میں شعر وفکشن کو ہم دانشوری کا حامل کہہ سکتے ہیں، مگر انھیں دانشورانہ اظہاریہ نہیں کہہ سکتے۔ شعر وفکشن میں بیش از بیش دانش ہوسکتی ہے، مگر یہ تخیلی، استعاراتی، علامتی پیرائے میں لپٹی ہوتی ہے؛ اسے شعر وفکشن سے دریافت کرنا پڑتا ہے، اس کی تعبیر کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا شعر وفکشن پر بعض تنقیدی مضامین دانشورانہ اظہاریہ ہوتے ہیں۔ اس امر کا احساس بعض اوقات خود تخلیق کاروں کو بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ شعر وفکشن لکھنے کے ساتھ ساتھ، مضامین بھی لکھتے ہیں، خصوصاً جب انھیں کسی سماجی مسئلے یا معاملے پر اپنے کسی واضح مؤقف کا اظہار کرنا مقصود ہو۔ معاصر عہد میں ارون دھتی رائے ایک ایسی شخصیت ہیں، جنھوں نے تخلیقی اور دانشورانہ اظہاریے میں فرق کی نہایت واضح لکیر کھینچی ہے۔ انھوں نے ناول لکھنا ترک کیا ہے، اور ہندوستان کے مسائل پر راست دانشورانہ تحریریں لکھنا شروع کی ہیں۔

دانشوروں کی اقسام

انیسویں صدی کے آخر میں جب دانشوروں نے ایک نئے سماجی طبقے کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنا شروع کی تو اس طبقے میں علم اور آرٹ کے سب شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ وہ شخص جو کچھ نہ کچھ تخلیق کرتا تھا، کسی خیال کے ابلاغ کی قدرت رکھتا تھا، اس کے قارئین ومخاطبین کا چھوٹا موٹا حلقہ تھا، اسے دانشور سمجھا گیا۔ ہمارے یہاں سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ، امیر علی، مولانا قاسم نانا توی اور ان سے ذرا پہلے غالب (خصوصاً اپنے اردو خطوط کے حوالے سے)، ماسٹر رام چندر، امام بخش صہبائی دانشور تھے، اگر چہ انھوں نے ا پنے لیے یہ لفظ اختیار نہیں کیا۔ تاہم انھوں نے اس زمانے کی نو آبادیاتی صورت حال سے پیدا ہونے والے تعلیمی، ثقافتی، معاشی، اخلاقی، سیاسی سوالات کے جوابات کی خاطر نئے خیالات قبول کیے یا تخلیق کیے، ان کی ترسیل کے لیے رسائل واخبارات کا سہارا لیا، اور اپنے

قارئین ومخاطبین کا ایک واضح حلقہ پیدا کیا۔ یہ سارا عمل دانشورانہ تھا۔ یہ لوگ شاعر، مضمون نگار، مؤرخ، سوانح نگار، ناول نگار، استاد، صحافی تھے۔ خود مغرب میں اور برصغیر میں دانشور طبقے کی یہ شناخت مبہم تھی۔ ان میں یہ بات تو مشترک تھی کہ ان کے ذہن وتخیل اپنے زمانے کے سلگتے ہوئے سوالوں پر مرتکز تھے، مگر ان میں طرز فکر یا تصور کائنات کا بنیادی نوعیت کا فرق تھا، اور اس کے نتیجے میں ایک ہی سوال کی تفہیم متضاد طریقے سے ہوتی تھی، اور یہ متضاد طریقہ ایک مسئلے کو دو مختلف پہلوؤں سے سمجھنے کی کوشش سے مختلف تھا۔ اس سے دو متحارب تصورات پیدا ہوتے تھے۔

اسی زمانے میں سرسید نے ''زاہد اور فلاسفر کی کہانی اور دو سلطنتوں کا مقابلہ'' کے عنوان سے ایک مضمون 'تہذیب الاخلاق' میں شائع کیا۔ یہ مضمون جو ایک کہانی کی ہیئت میں لکھا گیا ہے، اردو میں پہلی مرتبہ دو قسم کے دانشوروں میں تفریق کرتا ہے۔ مضمون میں ایک قسم کے دانشور کی نمائندگی زاہد، اور دوسری قسم کے دانشور کی ترجمانی فلاسفر کرتا ہے۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ زاہد اور فلاسفر دونوں خدا کے متلاشی ہیں، مگر دونوں کی تلاش کے طریقے جدا جدا ہیں۔ زاہد آنکھیں بند کیے، تسبیح وتہلیل کرتے ہوئے خدا کو ڈھونڈ رہا تھا، اور فلاسفر آنکھیں کھولے خدا کی صنعتوں کو دیکھ رہا تھا، اور ان صنعتوں میں خدا کی حکمت اور صفات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اتفاقاً دونوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے طے کیا کہ دنیا کی سیر کریں۔ پھرتے پھراتے، ایک ملک میں پہنچے۔ یہاں کا بادشاہ شان وشوکت، رعب ودبدبے اور فیاضی میں مشہور تھا۔ ''اس بادشاہ کی بادشاہت میں کوئی قانون نہیں تھا۔ جس کو چاہتا تھا نوازتا تھا، جس کو چاہتا تھا بگاڑتا تھا۔ جو چاہتا حکم دیتا، اور جس حکم کو چاہتا بدل دیتا۔ اس کی تمام رعایا خوف ورجا میں بسر کرتی تھی۔ نہ خدمت کرنے والوں کو توقع تھی کہ ضرور بادشاہ ہماری خدمت کی قدر کرے گا، نہ شریر اور شورہ پشتوں کو یہ خیال تھا کہ ضرور بادشاہ ہم کو سزا دے گا''۔ زاہد نے کہا کہ بادشاہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ہمارا خدا بھی ایسا ہی ہے۔ اس کے بعد دونوں اگلے ملک میں پہنچے۔ وہاں کے بادشاہ کا قانون خدائی قانون کی طرح کبھی تبدیل ہونے والا نہ تھا۔ ''اس کے وعدے ایسے مستحکم تھے کہ کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا تھا''۔ وہاں کوئی ایسے مصاحب بھی نہ تھے جو بادشاہ کے قانون کو حکم کو تبدیل کرا سکتے۔ وہاں کے لوگ طمانیت سے رہتے تھے، کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ انھیں ان کی کوشش کا پھل ملے گا۔ ''وہ یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ قادر مطلق اور خود مختار ہے۔ جو قانون کہ اس نے اپنی مرضی اور اپنے اختیار کامل سے بنایا ہے، اسی کامل قدرت اور اختیار سے اس کو قائم بھی رکھتا ہے''۔ زاہد نے ایسے بادشاہ کو کاٹھ کی مورت کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا، مگر فلاسفر نے اس بادشاہ کو پسند کیا(۷)۔

سرسید نے یہ مضمون اس وقت لکھا، جب اردو میں دانشوری کی روایت اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ سرسید نے بھانپ لیا کہ اردو کی دانشورانہ روایت، اپنی تشکیل کے اوائل ہی میں، داخلی سطح پر ایک گہرے تضاد کی حامل ہے۔ یہ تضاد صرف خیالات کا نہیں تھا، اس علمیات کا تھا، جس کے تحت دنیا وسماج کو سمجھا جا رہا تھا۔ ایک طرف 'مذہب اساس علمیات' تھی، اور دوسری طرف 'انسان اساس علمیات' تھی۔ پہلی علمیات اس مفہوم میں مذہب اساس ہے کہ یہ مذہبی تصورات وعقائد کی درستی یا توثیق پر زور دیتی ہے؛ یہ سماج وفطرت و

انسان کا مطالعہ کسی ایک یا زیادہ مذہبی صداقتوں کی توثیق کی خاطر کرتی ہے۔ دوسری قسم کی علمیات اس معنی میں انسان اساس ہے کہ یہ سماج ودنیا وانسان کو مطالعہ، ان کی حقیقی صورت حال کی تفہیم کی خاطر کرتی ہے۔ زاہد پہلی کی نمائندگی کرتا ہے، اور فلاسفر دوسری کی۔ زاہد جس دانشوری کی نمائندگی کرتا ہے، وہ سماج اور تاریخ کو انسانی ارادوں کا مظہر نہیں سمجھتی؛ اس کی نظر میں ماورائی طاقت، انسانی علم سے بعید ارادے کے تحت سماجی وتاریخی عمل میں مداخلت کرتی ہے؛ وہ چاہے تو قوانین کو توڑ دے، چاہے تو انھیں برقرار رکھے؛ ہم اس کی مصلحتوں کا راز نہیں پا سکتے۔ اس اعتقاد کا حامل دانشور کسی سماجی صورت حال کی ذمہ داری افراد یا طبقات پر عائد نہیں کرتا۔ ملوکیت، ملائیت، استعماریت، غربت، جہالت، دہشت گردی سب منشائے الٰہی سے ہیں، اور اکثر ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہیں۔ جب کہ فلاسفر جس دانشوری کی نمائندگی کرتا ہے، وہ ہر سماجی صورت حال کو انسانی ارادوں کے مظہر کے طور پر دیکھتی ہے، لہٰذا ہر صورت حال یا واقعے کی ذمہ داری افراد، طبقات یا اداروں پر عائد کرتی ہے۔ اس کی نظر میں جہالت وغربت سے لے کر دہشت گردی تک کے مسائل خاص سماجی ومعاشی وتعلیمی نظام کے پیدا کردہ ہیں۔ لاکھوں بے گناہ لوگوں کا مارا جانا، یا کروڑوں لوگوں کا حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا، یا بے شمار لوگوں کا اعلیٰ ترین خیالات، اعلیٰ درجے کے فنون سے مسرت حاصل کرنے سے محروم رہنا، یا اربوں لوگوں کا فرصت سے محروم رہ کر جانوروں کی طرح دن رات مشقت کرنا، مشیت ایزدی نہیں ہے۔ ان سب مسائل کے ذمہ داروں کے خلاف ایک واضح مؤقف اختیار کیا جا سکتا ہے، اور انھیں قابل مواخذہ سمجھا جانا جائز ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسید نے زاہد اور فلاسفر، دونوں کو خدا کی تلاش میں سرگرداں دکھایا ہے، مگر ایک کا خدا متلون مزاج ہے، اور دوسرے کا خدا اپنے بنائے گئے قوانین کو قائم رکھنے والا۔ اسی ضمن میں ایک اہم نکتہ سرسید نے یہ پیش کیا ہے کہ خدا یا مذہب کے بارے میں تصورات وعقائد محض ذہنی تجرید نہیں ہیں؛ ان کی گہری نسبت دنیا وسماج کو سمجھنے کے طریقوں سے ہے۔ گویا دنیا وسماج سے متعلق ہمارا فہم، ہمارے ان تصورات کا عکس ہوتا ہے، یا ان کے مماثل ہوتا ہے جنھیں ہم اپنی ذہنی زندگی میں غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک بنیادی اور بڑا تصور، ہماری روزمرہ کی فکر کے طریقوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم دنیا وسماج کو اس وقت تک تبدیل نہیں کر سکتے، جب تک اپنے ان بنیادی اور بڑے تصورات کو تبدیل نہ کریں۔ چونکہ تصورات کی تخلیق اور تبدیلی کا کام دانش ور انجام دیتے ہیں، اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ دانشور سماج کی تبدیلی میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

سرسید نے جن دانشوروں کو زاہد اور فلاسفر کے نام سے پہچانا، انھیں آج ہم مذہبی اور سیکولر دانشور کہتے ہیں۔ اطالوی مارکسی مفکر گرامشی نے بھی دانشوروں کی دو قسموں میں فرق کیا تھا: روایتی دانشور اور تنظیمی (جن کے لیے گرامشی Organic کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں) دانشور(۸)۔ گرامشی جنھیں روایتی دانشور کہتے ہیں، ان کی خصوصیات کم وبیش وہی ہیں جو سرسید نے زاہد سے منسوب کی ہیں۔ گرامشی روایتی دانشوروں میں اساتذہ، پادریوں اور ان منتظمین کو شامل کرتے ہیں جو نسل در نسل ایک ہی کام کیے چلے

جاتے ہیں۔ یہ اس لیے روایتی دانشور ہیں کہ وہ نئے خیالات کی تخلیق میں حصہ نہیں لیتے، پہلے سے موجود خیالات کا تحفظ کرتے ہیں؛ گویا منقولات کے حامی ہوتے ہیں۔ جب کہ تنظیمی دانشوروں میں گرامشی صنعتی ماہرین، سیاسی معیشت کے مخلصین، نئے کلچر اور نئے قانونی نظام کے منتظمین کو شمار کرتے ہیں۔ گرامشی نے یہ تفریق بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کی تھی، جب آخر الذکر ماہرین نے اپنی موجودگی محسوس کرانا شروع کی تھی۔ راجندر پانڈے کو اکیسویں صدی میں پانچ قسم کے دانشور نظر آتے ہیں: علمی اشرافیہ، انتظامی اشرافیہ، سماج کے نقاد، سماجی انقلاب کا ہراول دستہ، ذمہ دار مگر غیر وابستہ دانشور۔ حقیقت یہ ہے کہ دانشوروں کی یہ اقسام کافی مغالطہ آمیز ہیں۔ راجندر پانڈے کی انتظامی اشرافیہ دراصل گرامشی کے تنظیمی دانشوروں کا دوسرا نام ہے۔ البتہ علمی اشرافیہ سے مراد جامعات کے اساتذہ اور فنی ماہرین ہیں؛ انھیں علمی اشرافیہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ جس علم کی تخلیق کرتے ہیں، اسے اہل علم کے مخصوص حلقے تک محدود رکھتے ہیں؛ ان کے علم کی زبان، دلائل، اصطلاحات اسی حلقے کے لیے قابل فہم ہوتی ہیں؛ یہ اپنے علم کو اپنے شعبے یا ادارے کی طاقت بناتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انتظامی اشرافیہ کے لوگ اصل میں ماہرین ہیں، جو مختلف سرکاری وغیر سرکاری تنظیموں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لیے درکار مہارتیں حاصل کرتے ہیں۔ اول تو وہ علم کی تخلیق میں حصہ نہیں لیتے، موجود علم پر عبور حاصل کرتے ہیں، اور اسے متعلقہ تنظیم کے مالی فائدے کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کی آرا، خیالات، مؤقف سب کچھ اپنی تنظیم کے مقاصد کی نگہبانی کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ علم کی تخلیق کرتے ہیں، یعنی نئے موضوعات پر تحقیق کرتے بھی ہیں تو اس علم کے ثمرات ان کی تنظیم اٹھاتی ہے۔ ماہرین کا یہ طبقہ فن کی قدیم زمانے سے چلی آرہی قسموں 'آزاد و بے غرض' (Liberal) اور 'افادی' (Servile) میں فرق کرتے ہوئے، آخر الذکر سے تعلق قائم کرتا ہے۔ حقیقتاً جنھیں دانشور کہا جا سکتا ہے، وہ راجندر پانڈے کی بیان کی ہوئی آخری تین قسمیں ہیں۔ یعنی سماج کے نقاد، سماجی انقلاب کا ہراول دستہ اور ذمہ دار مگر غیر وابستہ اہل نظر۔ یہ لوگ 'آزاد و بے غرض علم' میں یقین رکھتے ہیں۔ جن دانشوروں نے انقلاب کا ہراول دستہ بننے کی سعی کی، ان کی فکر پر مارکسیت کا گہرا اثر تھا۔ جب کہ جن دانشوروں نے سماج کے نقاد کا کردار ادا کیا ہے، وہ کسی خاص فلسفے سے متاثر نہیں تھے؛ البتہ بعض اخلاقی اصولوں میں اعتقاد رکھتے تھے۔ دانشوروں کے گروہ میں کچھ اور لوگ بھی شامل کیے جانے لگے ہیں، جن کا ذکر کیا جانا چاہیے۔ مثلاً عوامی دانشور (Public Intellectual)، میڈیا ماہرین، سیکیورٹی تجزیہ نگار، اخباری کالم نگار۔ ان میں سے عوامی دانشور ایک حد تک مارکسی فکر سے متاثر ہے، مگر وہ انقلاب کا ہراول دستہ بننے، یعنی انقلابی تحریک کی قیادت کرنے سے زیادہ مقتدر طبقوں کی پالیسیوں کا نقاد ہوتا ہے۔ عوامی دانشور عوامی اہمیت کے مسائل پر واضح مؤقف اختیار کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں نوام چومسکی اور ارون دھتی رائے عوامی دانشور ہیں؛ دونوں اپنی اپنی ریاستوں کی امتیازی پالیسیوں پر سخت لفظوں میں نکتہ چینی کرتے ہیں، اور دونوں اپنی تنقید کی بنیاد علم اور تحقیق پر رکھتے ہیں۔ افسوس اردو میں اس وقت ہمیں کوئی عوامی دانشور نظر نہیں آتا؛ ہمیں اردو میں دانش کی کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دیتی، جو معاصر عہد کے عظیم المیے یعنی مذہبی شدت پسندی، طالبانیت اور دہشت گردی

کے خلاف جرأت سے اظہار کرتی ہو۔ یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ سماج کے نقاد اور عوامی دانشوروں کی جگہ ہمیں میڈیا ماہرین، سیکورٹی تجزیہ نگار اور اخباری کالم نگار اور سیاسی جماعتوں کے ترجمان نظر آتے ہیں؛ یہی لوگ خاص مسائل کو اجاگر کرتے ہیں، خاص طرح سے ان پر بحث کرتے ہیں، اور رائے بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دانشوروں کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے 'ذمہ دار مگر غیر وابستہ اہل نظر' کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لوگ نہ تو انقلاب کے داعی ہوتے ہیں، نہ ہر مسئلے پر اظہار رائے کرتے ہیں۔ دیگر دانشور کسی مسئلے کے سلسلے میں مؤقف، رائے یا پوزیشن اختیار کرنے میں یقین رکھتے ہیں، مگر 'ذمہ دار مگر غیر وابستہ اہل نظر' نئے علم، نئی نظر، نئی بصیرت، نئے وژن کی تخلیق میں یقین رکھتے ہیں۔ انھیں علم کی تخلیق کا حقیقی، بے ریا ذوق ہوتا ہے۔ وہ عموماً بنیادی اور بڑے تصورات سے بحث کرتے ہیں۔ عوامی دانشور فوری مسائل پر اپنا مؤقف پیش کرتا ہے، مگر غیر وابستہ اہل دانش ان سماجی ساختوں سے دل چسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں، جو فوری مسائل کا سبب اور سرچشمہ ہوتی ہیں۔

سماجی تبدیلی میں دانشور کا کردار

اب تک کی معروضات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ سماجی تبدیلی میں تنظیمی دانشوروں و ماہرین کا کوئی کردار نہیں ہوتا، اور نہ وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں۔ البتہ دوسرے دانشور کسی نہ کسی درجے میں سماجی تبدیلی میں حصہ لیتے ہیں۔ سماجی تبدیلی کے مفہوم اور سماجی تبدیلی برپا کرنے کے سلسلے میں دانشوروں کے یہاں مختلف تصورات رائج ہیں۔ بیسویں صدی کے اشتراکی دانشوروں نے سماجی تبدیلی سے سماج کی زیریں ساخت یعنی معاشی نظام کی مکمل تبدیلی یا انقلاب کا مفہوم لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ 'خیالات کا نظام' معاشی ساخت سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے اگر معاشی ساخت بدل دی جائے تو خیالات بھی بدل جائیں گے، مگر معاشی نظام کی تبدیلی کے لیے ذہنوں کو تیار کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا اشتراکی خیالات کی ترسیل و ترویج کی ضرورت ہے۔ اس صورت حال نے اشتراکی دانشوروں کے سامنے ایک بڑا چیلنج رکھا۔ اگر دانشور کا کام ایک ان تھک تنقیدی نظر کو بروئے کار لانا ہے؛ اپنے ذہن کو مسلسل حاضر رکھتے ہوئے، ہر نئی صورت حال کو اس کے اپنے تناظر میں سمجھنا ہے؛ خود کو کسی ایک آئیڈیالوجی کا شکار ہونے سے بچانا ہے؛ نئے خیالات کی تخلیق میں حصہ لینے کے اس میثاق کی پابندی کرنا ہے، جسے وہ دانشورانہ دنیا میں داخل ہوتے ہی قبول کرتا ہے، تو اشتراکی دانشور کیوں کر چند خاص، بندھے ٹکے نظریات کی پابندی کرتے ہوئے، دانشوری کا فریضہ ادا کر سکتا ہے؟ وہ زیادہ سے زیادہ اشتراکی انقلابی فکر کا مبلغ بن سکتا ہے۔ بلاشبہ اس چیلنج کو بعض اشتراکی دانشوروں نے محسوس کیا، اور قبول کیا، خصوصاً فرینکفرٹ اسکول کے دانشوروں نے؛ بعد ازاں التھیو سے، پیئر ماشرے اور ٹیری ایگلٹن نے۔ اردو کے اشتراکی دانشور، اشتراکی دانش کی تخلیق کے بجائے، اشتراکی نظریے کے مبلغ بنے۔ بایں ہمہ یہ اعتراف کیا جانا

چاہیے، ہمارے یہاں اتنی تبدیلی ضرور ہوئی کہ مقتدر طبقوں کی چند کھلی استحصالی تدبیروں کا فہم عام ہوا، اور لوگوں کو طاقت کے مراکز کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ ملا۔

جسے ہم آج عوامی دانشور کہتے ہیں، اسے ہم 'مابعد اشتراکی دانشور' کہہ سکتے ہیں۔ عوامی دانشور، اشتراکی دانشور کے سب سے بڑے خواب یعنی انقلاب میں خود کو شریک نہیں پاتا؛ وہ انقلاب کے بجائے اصلاحات کا حامی ہوتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ معاصر دانشورانہ فکر میں انقلاب کے تصور کی جگہ ارتقا کے تصور نے لے لی ہے۔ جو لوگ اب بھی انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں، وہ شدت پسندانہ نظریات کے حامل ہیں؛ وہ اپنا ایجنڈہ بارود کی طاقت سے نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقتاً دانشور نہیں، 'روایتی مذہبی دانشوروں' کے نظریات کے کٹر قسم کے محافظ ہیں۔

دانشوری کے ذریعے سماجی تبدیلی کا آغاز جدید عہد میں ہوا۔ جہاں جدیدیت نے نئے خیالات تخلیق کرنے کے ان تھک عمل کو ممکن بنایا، وہاں نئی ایجادات بھی ہوئیں۔ جدیدکاری کے نتیجے میں جو نئی ایجادات سامنے آئیں؛ ان میں ایک اہم مگر مؤثر ترین ایجاد پریس تھا۔ خیالات کو وسیع عوامی حلقے تک پہنچانے میں بنیادی کردار پریس کا تھا۔ دانشوری اور پریس (اور اس کی نئی صورتیں ٹی وی، انٹرنیٹ وغیرہ) لازم وملزوم ہیں۔ ابتدا میں دانشوروں نے منشور، پمفلٹ شائع کیے، بعد میں اخبارات، رسائل جاری کیے اور کتابیں شائع کیں۔ اردو کے ابتدائی، مگر ممتاز دانشور سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا، اور اس میں دیگر دانشوروں کو لکھنے کی دعوت دی۔ پریس کی وجہ سے انسانی سماج میں ایک نئی چیز نمودار ہوئی، جسے آج ہم 'عوامی منطقہ' (Public Sphere) کہتے ہیں؛ 'عوامی منطقہ' سماجی زندگی کا وہ علاقہ ہے، جہاں مشترکہ دلچسپی کے موضوعات پر گفتگوئیں ہوتی ہیں؛ بحث ومکالمہ ہوتا ہے؛ متضاد و متصادم نظریات پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ دانشوری کا عمل 'خیالات کی تخلیق' سے شروع ہوتا ہے، 'ترسیل کے جدید ذرائع' سے ہوتا ہوا 'عوامی منطقے' تک پہنچتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی تبدیلیوں کی آماجگاہ یہی عوامی منطقہ ہے۔ جن خیالات، یا جس طبقے کے خیالات کو عوامی منطقے تک جتنی آسان اور مؤثر رسائی حاصل ہوتی ہے، وہی تبدیلیاں لاتے ہیں۔ گرامشی جنھیں تنظیمی دانشور اور پانڈے جنھیں علمی اور تنظیمی اشرافیہ کہتے ہیں، ان کا کوئی تعلق عوامی منطقے سے نہیں ہوتا۔

عوامی منطقہ ایک ایسا میدان ثابت ہوا ہے جہاں ہر وقت خیالات، نظریات، کلامیوں، آئیڈیالوجیوں کا حشر برپا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب اصل جنگیں اسی منطقے میں لڑی جاتی ہیں۔ اس پر قبضے، اجارے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس اجارے کے ذریعے ایک طرف معلومات وخیالات پر قابو رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور دوسری طرف واقعات کی نمائندگی کے طریقوں پر حاوی ہونے کی سعی کی جاتی ہے۔ آج کے عوامی اور غیر وابستہ دانشوروں کے سامنے دو بڑے مسائل ہیں۔ پہلا مسئلہ 'عوامی منطقے' تک رسائی ہے۔ اس وقت اس منطقے پر برقی میڈیا اور اخباری کالم نگاروں کا اجارہ ہے۔ کتاب اس منطقے سے تقریباً غائب ہے۔ برقی میڈیا پر سیاسی جماعتوں کے ترجمان نظر آتے ہیں، کچھ سکیورٹی تجزیہ نگار یا اخباری کالم نگار۔ ان سب کو دانشور کہنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دانشوروں کی

قبیل کے دو چار لوگ اردو اخبارات میں کالم لکھتے ہیں، اور ان کی وجہ سے ہمارے سماج میں دانش کا کچھ نہ کچھ بھرم قائم ہے۔ ان میں انتظار حسین، امر جلیل، ایاز امیر، زاہدہ حنا، وجاہت مسعود قابل ذکر ہیں۔ میں نے دانستہ انھیں 'دانشوروں کی قبیل' کے افراد کہا ہے، اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی اس غیر معمولی تحقیق، مسلسل، ان تھک مطالعے، گہرے، ہشت پہلو تجزیے سے کام نہیں لیتا، جن کے بغیر دانش تخلیق نہیں ہوسکتی۔ ان کے پاس چند دانش مندانہ خیالات ضرور ہیں، جو سماج کی قدامت پسند، مبہم فکر کے مقابل نہایت قابل قدر محسوس ہوتے ہیں، لیکن اگر آپ ان کے دس بارہ کالم پڑھ لیں تو اگلے ہر کالم میں ظاہر کیے گئے مؤقف، یہاں تک کہ دلائل، محاوارت، مثالوں کی بھی پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں دانشوری کا دوسرا مطلب 'دانشورانہ' مؤقف لیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مسائل اور واقعات کے سلسلے میں ایک واضح، روشن خیالی وعقلیت پسندی پر مبنی مؤقف تو اختیار کرتے ہیں (اس مؤقف کی اہمیت و ضرورت سے کسی کافر ہی کو اختلاف ہوسکتا ہے)، مگر روشن خیالی وعقلیت پسندی جس نئے علم کی تخلیق کا تقاضا کرتی ہے، وہ نظر نہیں آتا۔ یہ علم 'ذمہ دار مگر غیر وابستہ دانش وروں' کی کتابوں میں ضرور موجود ہے، مگر وہ سماجی تبدیلی کے کسی عمل میں اس لیے شریک نظر نہیں آتیں کہ کتاب عوامی منطقے کے حاشیے پر ہے۔

عوامی اور غیر وابستہ دانشوروں کو دوسرا اہم مسئلہ جو درپیش ہے، وہ زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زبان ایک غیر جانب دار ذریعہ ابلاغ ہوتی ہے؛ وہ ہر قبیل کے آدمی کو ہر طرح کی بات ظاہر کرنے کی سہولت بہم پہنچاتی ہے؛ زبان کے لیے کوئی کافر ہے نہ مسلمان، مگر نو آبادیاتی عہد میں اردو کی مذہبی شناخت کیا قائم ہوئی کہ اس میں ہر قبیل کے آدمی کو ہر بات کہنے کی اجازت نہیں رہی۔ اس امر کا احساس اس وقت شدید ہوتا ہے جب ہم انگریزی اور اردو کے 'عوامی منطقوں' میں مقابلہ کرتے ہیں؛ دونوں میں قطبین کا بُعد پیدا ہو چکا ہے۔ انگریزی میں روشن خیال، آزادانہ فکر کسی خوف کے بغیر ظاہر کی جاسکتی ہے، مگر اردو میں روشن خیالی، تکثیریت، سیکولر فکر، مابعد جدید کثیر المعنیت جیسے الفاظ گالی کا درجہ اختیار کرتے جارہے ہیں۔ اردو کے روشن خیال مصنفوں کو لکھتے ہوئے، اس قدر احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ بعض اوقات ان کی تحریر ابہام کا شکار ہوکر مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اردو مصنفین خوف فسادِ خلق کے پیش نظر اپنی دانشورانہ تحریروں کو اشعار سے مزین کرتے ہیں۔ حالاں کہ کسی دوسری زبان میں دانشورانہ تحریر میں شاعرانہ ٹکڑے نہیں لگائے جاتے۔ اردو سے وابستہ مذہبی قوم پرستی اس درجہ شدید ہے کہ اردو میں لکھتے ہوئے ہر دانشور خود کو ایک غیر مرئی مقدس گروہ کے آگے جواب دہ محسوس کرتا ہے؛ اسے اپنے خیالات کے آزادانہ اظہار کے دوران میں یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں کسی مقدس گائے کی اہانت نہ ہو جائے، اور اسے سلاخوں کے پیچھے نہ دھکیل دیا جائے یا آگ کے سپرد نہ کر دیا جائے، یا اس پر فتوے نہ جڑ دیے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن تحریروں سے اردو کا عوامی منطقہ تشکیل پاتا ہے، اول وہاں قدامت پسند، رومانوی مذہبی قوم پرستانہ خیالات کا غلبہ ہے، دوم وہاں ذمہ دارانہ باتیں لکھنے کا فقدان ہے، سوم وہاں سنجیدہ دانشورانہ خیالات کے لیے جگہ اس قدر سکڑی سمٹی ہے کہ ان تحریروں کا مصنف خود کو بیگانہ محسوس کرتا ہے۔

اس بات پر زور دیے جانے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص دانشورانہ خیالات سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی تبدیلی کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ وٹگنسٹائن کا قول ہے کہ کسی نابغے میں کسی دوسرے دیانت دار آدمی کے مقابلے میں زیادہ روشنی نہیں ہے، مگر نابغے کے پاس خاص طرح کا محدب شیشہ ہوتا ہے جس سے وہ روشنی کو ایک نکتے پر مرتکز کر کے اسے شعلے میں بدل سکتا ہے۔ دانشور ایک نابغہ ہے؛ اس میں اور عام آدمی میں بس یہی فرق ہے۔ دانشور اور عام آدمی کے پاس 'ایک ہی طرح کی روشنی' یعنی مسائل کی تفہیم کی عقلی صلاحیت ہوتی ہے، مگر دانشور اس صلاحیت کو اس درجہ ترقی دیتا ہے کہ وہ نیا علم، نئی دانش، نئی بصیرت تخلیق کر لیتا ہے۔ تاہم مذکورہ سبب ہی سے عام آدمی دانشورانہ علم و بصیرت کو قبول کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ عام آدمی تک دانشورانہ خیالات کی روشنی پہنچے۔ سماجی تبدیلی کی راہ میں بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس روشنی کی ترسیل کی راہ میں کئی چیزیں حائل ہیں۔ ایک رکاوٹ تو خود عام آدمی کا عموماً تقلیدی مزاج ہونا ہے؛ وہ اکثر باتوں، نظریوں، اشتہارات، پروپیگنڈہ کو اسی تقلیدی مزاج کے تحت قبول کر لیتا ہے۔ اس میں سوال اٹھانے کی خلقی اہلیت موجود ہوتی ہے، مگر اسے 'رائے سازی' کی صنعت دبائے رکھتی ہے، جس پر سیاسی، مذہبی، تجارتی، ابلاغی، تعلیمی نصاب ساز اداروں کا اجارہ ہے، اور یہ دوسری بڑی رکاوٹ ہے۔ فقط دانشور ہی عام آدمی کی مذکورہ خلقی صلاحیت کو مخاطب کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حقیقی دانشورانہ خیالات کم از کم اردو پڑھنے والے عام آدمی تک نہیں پہنچ رہے۔ اس تک جو کچھ پہنچ رہا ہے، وہ مذہبی شدت پسندی، تنگ نظری پر مبنی قوم پرستی، فکشنی رومانوی تاریخ، ہیجانی اور پست قسم کی تفریحی چیزیں ہیں۔ دانشورانہ تصورات اپنی اصل میں 'خیال افروز' ہوتے ہیں؛ یعنی لوگوں کے پلو سے بندھے ٹکے خیالات باندھنے کی بجائے، انھیں سوچنے میں مدد دیتے ہیں۔ عظیم دانش مسائل کا ریاضیاتی حل نہیں بتاتی؛ اول یہ یقین پیدا کرتی ہے کہ انسانی دنیا کے مسائل انسانی صلاحیتوں کی مدد سے حل کیے جا سکتے ہیں؛ دوم مسائل حل کرنے کے راستے اور امکان سجھاتی ہے۔ عظیم دانش اس بات کو فراموش نہیں کرتی کہ چند بندھے ٹکے خیالات، خواہ کس قدر دلکش ہوں، بالآخر استبدادی ہونے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ اگر روشن خیالی بھی ایک بندھا ٹکا تصور بن جائے تو یہ اسی طرح استبدادی یعنی Tyrannical ہونے لگتا ہے، جیسے مذہبی شدت پسندی۔ جن دیوتاؤں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بالآخر ناکام ہوتے ہیں، وہ ایسے ہی دانشور ہوتے ہیں جو چند خیالات، یا کسی ایک نظریے کو ہمیشہ کے لیے سینے پر تمغے کی طرح سجا لیتے ہیں، اور لوگوں سے عزت اور ریاست سے ایوارڈ طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ حقیقی دانشور مسلسل نئے خیالات کی تخلیق کی دھن میں رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے پڑھنے والوں کو تجسس کے پیدا کردہ اضطراب کی حالت میں رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دانشور مثالی طور پر سماج میں جس تبدیلی کو ممکن بنا سکتا ہے، وہ یہی اضطراب ہے؛ ایک ایسا جذبہ جو دانشور اور اس کے قارئین کو 'مسافر در وطن' کی حالت میں رکھتا ہے!

حوالہ جات

۱۔ ''نورالغات''، جلد اول (مؤلف مولوی نورالحسن نیر) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ طبع سوم، ص ۱۴۰۴۔

۲۔ "Webster's New World College Dictionary"، میکملن، نیویارک، ۱۹۹۷ طبع سوم، ص ۷۰۲

۳۔ محمد کاظم، ''مسلم فلسفہ عہد بہ عہد''، مشعل، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۱۲۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔۱۲۶

۵۔ راجندر پانڈے، "The Role of Intellectuals in Contemporary Society"، متل پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰، ص ۲

۶۔ ایضاً، ص ۳

۷۔ سرسید، ''مقالات سرسید''، حصہ پانزدہم، (مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳

۸۔ جیمیس مارٹن (مرتب)، Antonio Gramsci: "Inellectuals, Culture and the Party"، روٹلیج، لندن، ۲۰۰۲، ص ۱۱۰

("ادبی دنیا"، جولائی 2015)

ایک روایت ہے کہ ایک ہم جیسا کاغذی دانشور سڑک پر گذر رہا تھا تو اس نے ایک ننھے سے بچے کو گتے کے ڈبے میں بیٹھ کر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ بچہ منہ سے جو آوازیں نکال رہا تھا، ان سے دانشور سمجھ گیا کہ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ بچے کی تربیت کرنی چاہیے۔ اس نے بچے کے پاس جا کر اسے مشورہ دیا کہ میاں ننھے، موڑنے سے پہلے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر مڑنے کا اشارہ ضرور دے دینا۔ بچے نے ڈرائیونگ روکی، غور سے دانشور کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اور فرمایا ''بڑے میاں! کیا آپ کو پتہ ہے کہ میں نے اپنے اسپیس شپ کی کھڑکی کھولی تو میں ہوا کے دباؤ کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خلا میں بکھر جاؤں گا؟''

تو جناب معاملہ یہی ہے کہ دانشوروں کو یہ پتہ ہوتا نہیں ہے کہ عوام گاڑی چلا رہے ہیں یا خلائی جہاز، مگر وہ نہایت حیران اور ناراض ہوتے ہیں کہ عوام کھڑکی سے ہاتھ باہر کیوں نہیں نکال رہے؟ ایسے ہی دانشور حضرات اکثر حیران ہوتے ہیں کہ عوام ایک صاف ستھری اور نہایت دانشور قسم کی قیادت کیوں منتخب نہیں کرتے ہیں؟ مسئلہ صرف یہ ہے کہ عوام جب اپنے مسائل کا بیان کرتے ہیں تو ساری دانشوری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

عدنان خان کاکڑ

انڈہ

اینڈی وئیر

ترجمہ: عاصم بخشی

تم اپنے گھر کے راستے میں تھے جب تمہاری موت واقع ہوئی۔

یہ ایک کار حادثہ تھا۔ کچھ خاص غیر معمولی نہیں لیکن بہر حال مرگ آور۔ تم نے اپنے پیچھے بیوی اور دو بچے چھوڑے۔ یہ ایک بے اذیت موت تھی۔ ہسپتال کے تکنیکی عملے نے پوری کوشش کی لیکن تم جانبر نہ ہو سکے۔ تمہارا جسم اس حد تک مسخ ہو چکا تھا کہ یقین کرو اچھا ہی ہوا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب ہماری ملاقات ہوئی۔

''ہائیں! یہ کیا ہوا؟'' تم نے کہا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

''تمھاری موت واقع ہوگئی،'' میں نے حقیقت پسندانہ لہجے میں کہا؛ آئیں بائیں شائیں کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔

''ایک ٹرک ... پھسلتا ہوا آ رہا تھا...''

''بالکل،'' میں نے کہا۔

''میں کیا میں مر چکا ہوں؟''

''ہاں۔ لیکن اس میں بُرا محسوس کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہر کوئی مرتا ہے،'' میں نے کہا۔

تم نے ارد گرد نظر دوڑائی، ہر طرف خالی پن تھا، صرف میں تھا اور تم تھے۔

''یہ کیا جگہ ہے؟'' تم نے پوچھا۔ ''کیا یہ حیات بعد الموت ہے؟''

''کم وبیش،'' میں نے کہا۔

''کیا تم خدا ہو؟'' تم نے پوچھا۔

''ہاں،'' میں نے جواب دیا۔ ''میں خدا ہوں۔''

''میرے بچے ... میری بیوی،'' تم نے کہا۔

''ان کا کیا؟''

''کیا وہ ٹھیک ٹھاک ہوں گے؟''

''میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''تم ابھی ابھی مرے اور تمھاری پہلی پریشانی تمھارا خاندان ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔''

تم نے میری طرف حیرانی سے دیکھا۔ تمھیں میں خدا کی طرح تو نہیں لگ رہا تھا، بس ایسا ہی نظر آتا تھا جیسے کوئی بھی اجنبی مرد، یا ممکن ہے عورت، یا شاید کوئی مبہم سی با اختیار شخصیت؛ خدا کی بہ نسبت کسی پرائمری اسکول کا استاد۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں،'' میں نے کہا۔ ''وہ بھلے چنگے ہیں۔ تمہارے بچے تمھیں ہر صورت ایک مکمل شخص کے طور پر یاد رکھیں گے۔ ان کے پاس تم سے بدظن ہونے کا وقت ہی نہیں تھا۔ تمھاری بیوی اوپر اوپر سے تو ماتم زدہ نظر آئے گی لیکن اندر سے اطمینان محسوس کرتی ہوگی۔ بھئی صاف بات ہے کہ تمھاری شادی شدہ زندگی بکھر رہی تھی۔ ہاں، اگر یہ خیال تمھیں کچھ سکون دیتا ہے تو یوں کہہ لو کہ وہ اس اندرونی اطمینان پر شرمسار ہوگی۔''

''اوہ،'' تمھارے منہ سے نکلا۔ ''تو اب کیا ہوگا؟ کیا میں جنت یا جہنم میں جاؤں گا یا کچھ اور؟''

''ان میں سے کچھ بھی نہیں،'' میں نے کہا۔ ''تمھیں نیا جنم ملے گا۔''

''آہ،'' تم نے کہا۔ ''تو ہندو درست تھے۔''

''تمام مذاہب ہی اپنے تئیں درست ہیں،'' میں بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

ہم خلا میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگے۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''کسی خاص جگہ نہیں،'' میں نے کہا۔ ''بس چہل قدمی کے ساتھ گپ شپ ذرا مزا دیتی ہے۔''

''تو آخر مقصد کیا ہے؟'' تم نے پوچھا۔ ''جب میں دوبارہ جنم لوں گا تو ایک خالی تختی ہوں گا نا؟ ایک بچہ۔ لہٰذا اس زندگی کے سارے اعمال و تجربات بس اکارت جائیں گے۔''

''ہرگز نہیں!'' میں نے کہا۔ ''تمہارے اندر اپنے سارے گذرے جنموں کا علم اور تجربہ موجود ہے۔ بس تمھیں ابھی وہ یاد نہیں۔''

میں چلتے چلتے رکا اور تمھیں دونوں کندھوں سے تھام لیا۔ ''تمھاری روح تمھارے تصور سے بھی زیادہ پُرشکوہ، خوبصورت اور دیوقامت ہے۔ انسانی ذہن میں بس تمھاری حقیقت کی ایک ننھی سی مقدار ہی سما سکتی ہے۔ یہ کسی گلاس میں انگلی ڈال کر یہ جانچنے کی طرح ہے کہ وہ گرم ہے یا سرد۔ تم اپنے آپ کا ذرا سا حصہ برتن میں ڈال کر باہر نکالتے ہو تو اندر موجود تمام تر تجربات حاصل کر چکے ہوتے ہو۔ تم پچھلے اڑتالیس سال سے ایک انسان کے اندر ہو اور پھیل کر اب تک اپنے باقی ماندہ بے پایاں شعور کو محسوس نہیں کر سکے۔ اگر ہم یہاں خاطر خواہ رکے رہیں تو تمھیں سب یاد آنا شروع ہو جائے گا، لیکن دو جنموں کے دوران یہ سب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''تو میں کتنے جنم لے چکا ہوں؟''

''اوہ، متعدد۔ کتنے ہی زیادہ اور کتنی ہی مختلف زندگیوں میں،'' میں نے کہا۔''اس بار تم ۵۴۰ عیسوی میں ایک چینی کسان لڑکی ہو گے۔''

''ذرا ٹھہرو، کیا؟'' تم ہکلائے۔''تم مجھے ماضی میں بھیج رہے ہو؟''

''ہاں تکنیکی طور پر تو شاید ایسا ہی ہے۔ وقت، جیسا کہ اسے تم جانتے ہو، صرف تمھاری کائنات میں ہی موجود ہے۔ جہاں سے میں آیا ہوں، وہاں صورت حال مختلف ہے۔''

''تم کہاں سے آئے ہو؟'' تم نے پوچھا۔

''اوہ یقیناً،'' میں نے وضاحت کی۔''میں کہیں سے تو آیا ہوں؛ کسی دوسری جگہ سے۔ اور میرے جیسے دوسرے بھی ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم جاننا چاہو گے کہ وہاں سب کچھ کیسا ہے لیکن یقین مانو تم نہیں سمجھ سکتے۔''

''اوہ،'' تم نے ذرا مایوسی سے کہا۔''لیکن سنو، اگر میں وقت کے سلسلے میں مختلف جگہوں پر جنم لیتا ہوں تو کسی نہ کسی وقت خود سے بھی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔''

''یقیناً۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور چونکہ دونوں زندگیاں صرف عمر کا ادراک رکھتی ہیں اس لئے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اصل واقعہ کیا ہے۔''

''تو پھر آخر اس سب کا مقصد کیا ہے؟''

''واقعی؟'' میں نے پوچھا۔''میرا مطلب ہے تم سنجیدگی سے حیات کے معنی جاننا چاہتے ہو؟ کیا یہ ذرا ڈھیلا ڈھالا سا کلیشے نہیں؟''

''یہ ایک معقول سوال ہے،'' تم اپنے سوال پر اڑے رہے۔

میں نے تمھاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔''حیات کے معنی یعنی میرے لیے اس ساری کائنات کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ تم بالغ ہو جاؤ۔''

''تمھارا مطلب ہے انسانیت؟ یعنی تم چاہتے ہو کہ ہم بالغ ہو جائیں؟''

''نہیں، صرف تم۔ میں نے یہ پوری کائنات تمھارے لیے تخلیق کی ہے۔ ہر نئی زندگی کے ساتھ تم پھلتے پھولتے ایک جسیم و عظیم گیانی بن جاتے ہو۔''

''صرف میں؟ باقی سب کا کیا؟''

''دوسرا کوئی ہے ہی نہیں،'' میں نے کہا۔''اس کائنات میں صرف میں اور تم ہی تو ہیں۔''

تم نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔''لیکن زمین پر موجود اتنے بہت سے لوگ...؟''

''ہر ایک تم۔ تمھارے مختلف جنم۔''

''ہائیں! میں ہر کوئی ہوں!''

''اب تم بات سمجھے،'' میں نے شاباشی سے تمہاری کمر تھپتھپائی۔

''میں ہر ایک انسان ہوں جو کبھی بھی تھا؟''

''اور کبھی بھی ہو گا، ہاں۔''

''میں ابراہام لنکن ہوں؟''

''اور تم جان ولکس بوتھ بھی،'' میں نے لقمہ دیا۔

''میں ہٹلر ہوں؟'' تم نے ہیبت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اور وہ لاکھوں لوگ بھی، جنھیں اس نے قتل کیا۔''

''میں عیسیٰ ہوں؟''

''اور ہر کوئی جس نے اس کی اتباع کی۔''

تم خاموش ہو گئے۔

''تم نے جب بھی کسی کو نشانہ بنایا،'' میں نے کہا،''تم آپ اپنا نشانہ بنے۔ کوئی بھی نیکی کی تو اپنے ساتھ کی۔ کسی بھی انسان کا کوئی بھی مسرت و غم کا لمحہ دراصل خود تمھارا ہی تجربہ تھا اور ہو گا۔''

تم نے کافی دیر سوچا۔

''کیوں؟'' تم نے پوچھا۔''آخر یہ سب کس لیے؟''

''کیوں کہ کسی دن تم میرے جیسے بن جاؤ گے، کیوں کہ تم یہی ہو۔ تم میری ہی نوع سے ہو۔ میرے بچے ہو۔''

''ہائیں،'' تم نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔''تمہارا مطلب ہے میں خدا ہوں؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی تو تم جنین ہو۔ مسلسل بڑھ رہے ہو۔ ایک دفعہ تم وقت کے کل پھیلاؤ میں موجود ساری زندگیاں جی لو تو پیدائش کے قابل ہو جاؤ گے۔''

''تو یہ ساری کائنات،'' تم نے کہا،''یہ صرف ...''

''ایک انڈہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔''چلو اب اگلے جنم کا وقت ہو گیا۔''

اور یوں میں نے تمہیں اپنی منزل کی جانب روانہ کر دیا۔

[''لالٹین''، ۴ جنوری ۲۰۱۸]

ان بیوقوفوں کو آزاد کرانا مشکل ہے،
جو اپنے زنجیروں کی عزت کرتے ہیں۔

والٹیئر

سُر، لفظ اور تال

یاسر اقبال

فن موسیقی تین چیزوں کا امتزاج ہے؛ سُر، لفظ اور تال۔ موسیقی میں ان تینوں عناصر کی اپنی اپنی جداگانہ اہمیت ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں لفظ کی غنائی نوعیت کو موسیقی کی مختلف فارمز (ہیئت) کے ذریعے زیرِ بحث لایا جائے گا۔ ہر لفظ اپنی ایک غنائی ترکیب کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے صوت، لفظ اور غنا دونوں پر مقدم ٹھہرتی ہے، کیونکہ صوت سے ہی لفظ تشکیل پاتا ہے اور غنا (موسیقی) بھی صوت ہی سے ترتیب پاتی ہے۔ لفظ آوازوں کا ہی ایک مجموعہ ہوتا ہے، آوازوں کے اس مجموعے کو ایک خاص معنویت دے دی جاتی ہے۔

ماہرِ لسانیات کے نزدیک زبان گلے سے نکلی ہوئی ایسی آوازوں پر مشتمل ہوتی ہے جس میں اس کی معنویت اس زبان کے بولنے والوں نے شعوری طور پر متعین کی ہوتی ہے۔

اس کی معنویت میں اشاروں، چہرے اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ زبان کے اس عمل کو شعوری کی بجائے نفسیاتی عمل قرار دیتے ہیں، کچھ اس عمل کو حیاتیات سے جوڑ دیتے ہیں اور کچھ کے نزدیک زبان مخصوص علامات کا ایک نظام ہوتا ہے۔ پیشِ نظر مضمون میں موسیقی کے حوالے سے ہمارا تعلق صرف لفظ کے معنوی اور صوتی تصور سے ہوگا۔

لفظ اور معانی کا آپسی جو رشتہ استوار ہوا ہے یہ عمل کس بنیاد پر ہوا ہے، یعنی اس کے پس منظر میں وہ کیا عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو لفظ کی معنویت کا تعین کرتے ہیں۔ یہ وہ پیچیدہ مسئلہ ہے، جو صدیوں سے ماہرِ لسانیات کا موضوع رہا ہے۔ موسیقی کا لفظ اور معانی کے اس پیچیدہ مسئلے سے ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ دوسرا لفظ کے غنائی یا صوتی تصور کے حوالے سے دیکھا جائے تو موسیقی میں حروفِ علت (vowel) حروفِ صحیح (consonant) کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ موسیقی کا اصل تعلق حروفِ علت سے ہے تو غلط نہ ہوگا، کیونکہ یہی وہ حروف ہیں جن کو کھینچ تان کر کے یا گھٹا بڑھا کر ان سے صوتیت یا غنا پیدا کی جاتی ہے۔ اس امر کی وضاحت کے لیے ایک

جملہ مثال کے طور پر لے لیتے ہیں:

میں آج گھر جاؤں گا
میں آج گھر جاؤں گا
میں آج گھر جاؤں گا
میں آج گھر جاؤں گا
میں آج گھر جاؤں گا؟
میں آج گھر جاؤں گا!

اس جملے کو روزمرہ کے مطابق مختلف طریقوں سے ادا کر کے مختلف معانی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ جملے سے مختلف معانی برآمد کرنے کے لیے صرف الفاظ پر تاکید کو بدلنا ہوگا۔ جملے میں مختلف مقامات پر ٹھہرنے اور کچھ الفاظ کو کھینچ کر ادا کرنے سے مفاہیم میں تبدیلی واقع ہوتی جائے گی۔ یہ معنی آفرینی عمل موسیقی میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

موسیقی میں حروفِ علت پر معنی آفرینی کے اس عمل سے ایک ہی لفظ سے مختلف احساسات اور اس کی معنویت کو برآمد کرنا ممکن ہے۔

اس طرح ایک ہی لفظ سے حیرت، استعجاب، خوف، امید، مسرت، طنز، نفی، اثبات اور استفہام کی معنویت برآمد کی جا سکتی ہے اور ایک ہی لفظ سے کثیر المعانی کے اس امر کی مثالوں کو صرف اور صرف موسیقی سے ہی سمجھا جا سکتا ہے؛ جب ایک لفظ کو مختلف غنائی لہجوں میں ادا کیا جائے تو اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

زبان کے عام بول چال کے لہجہ کے برعکس زبان کے غنائی لہجہ سے الفاظ کی معنویت بدلتی ہے۔ عام بول چال کے لہجے میں لفظوں کی معنویت متعین ہوتی ہے، جبکہ موسیقی میں ماہر مغنی اپنے غنائی لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ان کے معنی اور احساسات میں ردوبدل کرتا ہے۔ معنی آفرینی کا یہ عمل موسیقی میں خاص کر ان جذبات و کیفیات کے ابلاغ کا سبب بنتا ہے، جہاں ابلاغ کے دیگر ذرائع پوری طرح ساتھ نہیں دے پاتے۔ بقول رشید ملک؛ ''جہاں ابلاغ کے مختلف ذرائع کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں وہاں سے موسیقی کی اقلیم شروع ہوتی ہے۔ موسیقی بھی ایک زبان ہے۔ جس کے اپنے حروفِ تہجی، اپنے الفاظ، اپنی لسانی ترکیبیں، اپنا روزمرہ، صرف و نحو اور فصاحت و بلاغت کے لیے اپنے معیار ہیں۔ یہ زبان ان کیفیات اور جذبات کا ابلاغ کرتی ہے جن کی ترسیل کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔'' ('راگ درپن کا تنقیدی جائزہ'۔ ص،۴۵۴)

یہی وجہ ہے کہ کسی فلم میں ڈرامائی عناصر کو تقویت دینے میں موسیقی ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ فلمی گانوں کو فلمی سین، کسی ایکٹر کی شخصیت یا اس کے جذبات و احساسات کو اجاگر کرنے یا ابھارنے کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ فلم یا ڈراما میں کسی کردار کی باطنی کیفیت کا ابلاغ کسی گانے ہی کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

فلمی موسیقی میں شعری ضابطے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور گانے کے الفاظ کا معانی کے ساتھ گہرا اور مضبوط رشتہ استوار کرنے کے لیے؛ چاہے فن موسیقی کے دیگر اصول وضوابط کو نظر انداز ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہی صورت حال عوامی موسیقی میں ہوتی ہے؛ عوامی موسیقی میں بھی شاعری بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور لفظوں کی ادائیگی میں گانے والا معانی اور تفہیم کے عمل کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، گائیکی کے اس عمل میں سُر کی اور دیگر فن موسیقی کی شعریات ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ فلمی موسیقی اور عوامی موسیقی میں اکثر گانوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

اس لیے کہا جاتا ہے کہ فلمی موسیقی اپنی ذات میں ایک فن نہیں ہے بلکہ ایک ہنر یا تکنیک ہے جس کا مقصد صرف اور صرف ڈرامائی عناصر کو تقویت دینا ہوتا ہے۔ فلمی موسیقی ہو یا فلمی شاعری دونوں فلم کی کہانی کے تابع ہوتے ہیں؛ باوجود اس کے فلمی موسیقی ہر دور میں ایک خاص اہمیت کی حامل رہی ہے۔

اس کی اپنی ایک خاص وضع قطع ہوتی ہے۔ فلمی گانے کافی چنچل اور شوخ ہونے کے ساتھ ساتھ کافی اثر انگیز ہوتے ہیں، جن میں معنوی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ فلمی موسیقی اور فلمی شاعری خاص طرح کا رومانی تاثر لیے ہوئے ہوتے ہیں، جس سے ڈرامائی کیفیت کا تاثر بھرپور انداز سے ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

کلاسیکی موسیقی یا موسیقی کی آرٹ فارم جو کافی ریاضت طلب فن ہے۔ فلمی موسیقی اور عوامی موسیقی سے کافی مختلف ہے۔ فلمی موسیقی اور عوامی موسیقی کے برعکس اس میں لفظوں کو سُر کے تابع کر کے ادا کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی کی اس آرٹ فارم میں ہمیشہ سُر کو اولیت حاصل رہی ہے۔ راگ کا الاپ، گانے کو مکمل طور پر راگ کے رچاؤ کے ساتھ مخصوص کلاسیکل لے تال میں پیش کرنا کلاسیکی موسیقی کی خاصیت ہے۔

کلاسیکی گائیکی میں فن موسیقی کی تمام حدود و قیود اور ضابطوں کا پابندی کے ساتھ خیال رکھا جاتا ہے، جب کہ فلمی موسیقی یا عوامی موسیقی میں یہ پابندیاں ضروری نہیں ہوتیں۔ کلاسیکی موسیقی میں جو گانے والا ہوتا ہے، وہ ایک منجھا ہوا مغنی ہوتا ہے جو فن کی باریکیوں پر مکمل دسترس رکھتا ہے اور گانے کے دوران اس کی پیشکش باقی تمام چیزوں پر حاوی رہتی ہے؛ مثلاً وہ سازوں میں خود کو پابند کر کے نہیں گائے گا اور نہ ہی اس کی گائیکی کا انداز پہلے سے متعین کردہ ہوگا۔ اس کا تان، پلٹا، مرکی، زمزمہ اور دوسرے النکار وغیرہ ہر چکر میں پہلے والے تان، پلٹے اور زمزمہ سے مختلف اور جداگانہ ہوں گے۔

موسیقی کی جمالیات بھی یہی تقاضا کرتی ہے کہ غنائی ترکیبوں کی تکرار پیدا نہ کی جائے، کیوں کہ اعادہ یا تکرار سے فن پارہ معیار سے گر جاتا ہے۔ گانے کے آغاز سے لے کر اختتام تک وہ ہر چیز سے آزاد رہے گا، لیکن اس کی گائیکی موسیقی کے اصول وضوابط سے باہر نہیں جائے گی۔ پوری گائیکی کے دوران مغنی کا سارا زور راگ کو متشکل کرنے پر صرف ہوگا، کیوں کہ کلاسیکی موسیقی اور دیگر موسیقی کے اوضاع میں یہی فرق ہوتا ہے کہ کلاسیکی موسیقی میں راگ اپنی تمام رعنائیوں اور جمالیات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ کلاسیکی گائیک اور فلمی موسیقی کے گائیک میں وہی فرق ہوتا ہے جو فلمی شاعر اور غیر فلمی شاعر میں ہوتا ہے۔

فلمی شاعر اپنی شاعری اور موضوع کی تخلیق کے حوالے سے فلمی کہانی اور اس کے ڈرامائی عناصر کا پابند ہوگا، جب کہ غیر فلمی شاعر ایسی تمام روشوں سے آزاد ہوگا جن کا تعین پہلے سے کیا گیا ہوگا۔ فلمی شاعر کے برعکس غیر فلمی شاعر تخیل، موضوع اور جذبات واحساسات میں پہلے سے متعین کی گئی کسی چیز کا پابند نہیں ہوگا۔ اس کی شاعری اس کے اپنے جذبات، تجربات اور مشاہدات کی غماز ہوگی، لیکن شاعری کے اصول وضوابط کا وہ پوری طرح خیال رکھے گا۔

جہاں تک کلاسیکی موسیقی میں لفظ اور اس کے معانی کا تعلق ہے تو کلاسیکی موسیقی کی آرٹ فارم میں لفظ اور معنی کا آپس میں رشتہ معطل ہو جاتا ہے؛ لفظ کو اس طرح سُر میں توڑ موڑ کر ادا کیا جاتا ہے کہ اس کی غنائی اہمیت تو بڑھ جاتی ہے لیکن معنوی سطح پر وہ گر جاتا ہے۔ اس ضمن میں رشید ملک رقمطراز ہیں: ''جب موسیقی آرٹ فارم بنتی ہے تو الفاظ اور معانی کا رشتہ معطل ہو جاتا ہے۔ لفظ اپنی ادبی حیثیت کھو دیتا ہے اور اپنی انفرادیت سے دست کش ہو کر نئی نئی صورتیں اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔'' ('راگ درپن کا تنقیدی جائزہ'، ص، ۴۴۸)

دھرو پد، خیال، ترانہ، پربندھ، دھمار، تروٹ اور پد جو موسیقی کی آرٹ فارم کی اہم اقسام ہیں، ان میں پوری توجہ سُر پر ہی رہتی ہے اور لفظ ٹکڑوں میں تقسیم اس طرح ہو جاتا ہے کہ اس کی پہچان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی شکل وصورت یعنی مارفولوجی بالکل بدل جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں موسیقی کی آرٹ فارم میں شعری ضابطے ثانوی سطح پر چلے جاتے ہیں اور موسیقی کی شعریات کی پابندی اور سُر کی ادائیگی ہر چیز سے مقدم ہو جاتی ہے۔ موسیقی کی اس فارم میں سُروں کے ذریعے جذبے یا احساس کی ترسیل کی جا رہی ہوتی ہے جو کافی مشکل کام ہوتا ہے۔ لفظ کی معنویت کو غنائی ترکیب سے برآمد کیا جا رہا ہوتا ہے۔

نیم کلاسیکی موسیقی دیگر موسیقی کی فارمز کی نسبت موسیقی کی آرٹ فارم کے قدرے زیادہ قریب ہے۔ نیم کلاسیکی موسیقی میں ٹھمری، غزل وغیرہ آ جاتے ہیں لیکن ان میں بھی لفظ کا معنی کے ساتھ مکمل طور پر رشتہ قائم رہتا ہے اور گائیکی کے دوران شعری ضابطے زیادہ اہمیت اختیار کیے رکھتے ہیں۔ جب کہ موسیقی کی آرٹ فارم میں لفظ کے معانی غنا میں معدوم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو لفظ کی ادائیگی کو اس طرح غنائی ترکیب میں باندھا جاتا ہے کہ اس کی شکل بھی بگڑ کر رہ جاتی ہے۔ دراصل موسیقی کی آرٹ فارم جو خالص کلاسیکی موسیقی پر مشتمل ہے، اس میں مغنی فن موسیقی کے تمام اصولوں وضوابط کو دیگر تمام چیزوں پر؛ چاہے وہ شاعری ہے، لفظ یا اس کی معنوی وضاحت ہے، سب پر مقدم سمجھتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیقی کی آرٹ فارم اپنی ذات میں مکمل ایک زبان ہے جس میں جذبات و احساسات اور مافی الضمیر کا ابلاغ سُروں کے ذریعے کیا جاتا ہے اور ایسے خفیف جذبات واحساسات، جن کا ابلاغ لفظ اور اس کی معنوی کش مکش میں پھنس کر رہ جاتا ہے، ایسے جذبات واحساسات کا ابلاغ موسیقی کی آرٹ فارم کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے؛ بشرطیکہ اس فارم میں 'ابلاغ کے فن' پر مغنی پوری طرح دسترس رکھتا ہو، اس کے فن میں کسی طرح کا جھول نہ ہو اور وہ لفظوں کے صوتی تاثر سے ہی معنی پیدا کرنا جانتا ہو۔ لفظ کی

صوتی تاثیر کے حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں: ''معانی سے الگ ہوکر بھی ہر لفظ کا اپنا ایک خاص تاثر ہوتا ہے، جس کا تعلق ان حروف کی آوازوں اور ان کی ترتیب سے ہوتا ہے جن سے کوئی لفظ بنتا ہے۔کوئی لفظ ناچتا، گنگناتا ہے، کوئی روتا بسورتا ہے۔کوئی لبھاتا ہے، کوئی سننے والے کے ذہن پر خوف کا تاثر چھوڑتا ہے اور کوئی سرخوشی و سرمستی کا تاثر دیتا ہے۔لفظ کے اس تاثر کو جس کا تعلق لفظ کی آوازوں سے ہوتا ہے صوتی تاثر کہتے ہیں۔'' ('کشاف تنقیدی اصطلاحات'، ص۔۱۱۶)

لفظ کی موسیقیت دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے؛ اصوات کی موسیقیت اور معانی کی موسیقیت۔ اول الذکر کا تعلق اس صوتی تاثر سے ہے جو ان حروف کی آوازوں پر مشتمل ہوتا ہے، جس سے وہ لفظ تشکیل پاتا ہے۔صوتی تاثر سے تشکیل پانے والی موسیقی لفظ کی خارجی موسیقی کہلائے گی۔موخر الذکر کا تعلق لفظ کی معنوی تاثیر سے ہوتا ہے، لفظ کے معنوی احساس سے ایک لطیف موسیقیت وجود میں آتی ہے۔معنوی تاثر سے پیدا ہونے والی موسیقی لفظ کی داخلی موسیقی کہلائے گی۔

کلاسیکی موسیقی میں تیسرا اہم شعبہ تال کا ہوتا ہے۔موسیقی کی آرٹ فارم میں تال کا چکر اپنے متعین کردہ ماتروں کے ساتھ ایک دائرہ میں حرکت کرتا ہے۔تال دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے؛ ایک تال کے ماتروں کا آدھا چکر جہاں مکمل ہوگا، اس مقام والا ماترا خالی (خال) کہلائے گا اور جہاں ماترے اپنا مکمل چکر پورا کر دیں گے وہ مقام سم کہلائے گا۔مثال کے طور پر تین تال کے ٹھیکے کا چکر دیکھیں تو اس میں خالی اور سم کی وضاحت ہوجائے گی:

دھا (سم) دھن دھن نا دھا دھن دھن نا تا (خالی) تن تن نا دھا دھن دھن نا دھا (سم)

اس تال کے کی اگر تقطیع کی جائے تو اس تال کے چار حصے بنتے ہیں اور ہر حصہ چار ماتروں پر مشتمل ہے ذیل میں اس کی تقطیع دیکھیں:

تین تال، ماتروں کی تعداد 16

۱۔دھا دھن دھن نا (چار ماترے/ ارکان)

۲۔دھا دھن دھن نا (چار ماترے/ ارکان)

۳۔تا تن تن نا (چار ماترے/ ارکان) یہ حصہ خالی یا خال کہلاتا ہے۔

۴۔دھا دھن دھن نا (چار ماترے۔ارکان)

اسی طرح دیگر تالوں میں بھی ماتروں کی تقسیم اسی فارمولے پر ہوتی ہے، البتہ ہر تال میں ماتروں کی تعداد الگ الگ متعین ہوتی ہے؛ جیسے مغلئی، دھادرا، کہروا، جھپت تال، یک تال وغیرہ میں ماتروں کی تعداد ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر تال کا اپنا ایک الگ تشخص اور اپنی انفرادیت ہے۔موسیقی کی کوئی فارم بھی تال کے بغیر تشکیل نہیں پاسکتی۔ بندش کے لفظ؛ چاہے وہ حروف صحیح پر مشتمل ہوں یا حروف علت پر سب تال میں بندھے ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح کسی موزوں شعر کے الفاظ اس کی بحر کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔

تال کے ماتروں کے حساب سے ہی پوری بندش کا صوتی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے اور ماتروں کے حساب سے ہی سُر اور الفاظ متحرک یا ساکن ہوتے رہتے ہیں۔تال کی لے دو صورتوں میں چلتی ہے۔بلمپت لے اس میں ماتروں کے درمیان وقفہ اس قدر زیادہ ہوتا ہے یعنی لے اس قدر آہستہ ہوتی ہے کہ تال کی پہچان رکھنا بھی مشکل ہوجاتا ہے، اس لے میں تال کے چکر کو سمجھنا کافی ذہانت اور محنت طلب کام ہوتا ہے۔خیال، دھرپد، تروٹ، ترانہ وغیرہ جیسی آرٹ فارمز کو گاتے ہوئے مغنی کو کو تال کی اسی لے سے نبھا کرنا ہوتا ہے۔لے کی دوسری صورت دُرت لے کی ہے، اس میں لے کی رفتار تیز ہوتی ہے اور تال کے چکر کو سمجھنا قدرے آسان ہوتا ہے۔غزل، ٹھمری، گیت، اور کافی وغیرہ کا چلن، تقریباً اسی لے میں ہوتا ہے۔

موسیقی کی آرٹ فارم میں مغنی بلمپت لے میں جب بندش پیش کر رہا ہوتا ہے تو لفظ کو وہ سُر کے تابع کر کے اس طرح ادا کرتا ہے کہ لفظ کا معنی کے ساتھ رشتہ کم، سُر کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔مغنی لفظ کے صوتی تاثر سے ہی اس کی معنویت کشید کرتا ہے، لیکن غنائی ترکیب کا یہ عمل کافی مشکل ہوتا ہے۔لہٰذا، موسیقی کی آرٹ فارم میں جہاں مغنی کے لیے فن میں پختہ کار ہونا ضروری ہے، وہاں سامعین کا بھی اس فن کی مبادیات کے حوالے سے تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے، ورنہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوگا۔

کتابیات

۱۔رشید ملک، ''راگ درپن کا تنقیدی جائزہ'' مع متن و ترجمہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۸

۲۔جمیل جالبی، ''ایلیٹ کے مضامین''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶

۳۔شمس الرحمٰن فاروقی، ''شعر، غیر شعر اور نثر''، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵

۵۔قاسم یعقوب، ''تنقید کی شعریات''، پورب اکادمی، اسلام آباد

۶۔انجم شیرازی، ''مبادیات موسیقی''، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵

[''ایک روزن''، ۱۱ اگست ۲۰۱۷]

موسیقی کا کینوس کسی بھی دوسرے فن کی نسبت زیادہ لامحدود ہے۔تصویر بنائی، جو کچھ بھی ہے، بس سامنے ہے۔کیمرے سے کھینچی، تب بھی فریم کی قید ہے۔مجسمہ بنایا، زمان و مکان کی پابندی لازمی ہوئی۔ڈرامہ سٹیج کیا، تھیٹر کے اندر جانے پر مجبور ہوگئے۔فلم بنائی، کسی بھی سکرین کے سامنے بیٹھ کر دیکھی۔افسانہ لکھا، پڑھنے والے نے کتاب اٹھائی، صفحے پلٹے، پڑھتا چلا گیا، کتاب بند، افسانہ ختم۔ تاج محل تک بنادیا لیکن یا تو وہاں جا کر دیکھیے یا پھر وہی فریم کی قید! موسیقی مگر لامحدود ہے۔

حسنین جمال

محبت کا عالمی دن جو سینٹ ویلنٹائن کے نام سے موسوم ہے اس کی تاریخ ماقبل و آخر اس سے تو ہمیں چنداں دلچسپی نہیں، لیکن اس ایک بحث سے ضرور شغف رہتا ہے کہ آیا یہ محبت کا دن ہمیں منانا چاہیے یا نہیں؟ میرے لیے تو یہ دن بھی ان تمام عالمی دنوں جیسا ہے جو مختلف مواقع، جذبات، انسانوں اور جانوروں سے موسوم ہوتے ہیں۔ اس دن کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسے جذبے سے ماخوذ ہے جو ہمارے ہاں قبول عام رکھتا ہے اور وسیع پیمانے پر اپنائے جانے کے باوجود دانستہ طور پر نظرانداز ہی نہیں کیا جاتا بلکہ مطعون بھی کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں محبت اور محبت کا عالمی دن دونوں ہی متنازعہ حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ لوگ جو محبت کے حامی ہیں، وہ بھی ویلنٹائنز ڈے کے خلاف محاذ آرا نظر آتے ہیں، شاید اس کی وجہ تسمیہ جناب ویلنٹائن صاحب کا نام ہو سکتا ہے۔ مغرب سے آئی ہر (امپورٹڈ) شے ہمیں مرغوب ہے، سوائے اس ایک دن کے۔ کچھ لوگ محبت کرنا چاہتے ہیں، لیکن اسے وہ ایک دن کا پابند نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ روزانہ محبت کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ محبت کو پاک اور ناپاک کے تصور سے جوڑتے ہوئے اس کے ڈانڈے زوجین، بہن بھائی، ماں باپ اور دیگر اہل خانہ کی محبت سے جوڑ کر اسے مشرف بہ مذہب کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک محبت انتہائی گرا ہوا اور گھٹیا جذبہ ہے، جس سے ہر صورت اپنے خاندان کی خواتین کو اس سے بچانا ان کا اولین فریضہ ہے، خواہ وہ خود دن بھر اور سال کے تین سو پینسٹھ دن صنف نازک ہی نہیں، اپنی صنف تک کی اسکن ٹائٹ جینز اور تیسری جنس تک کے لچکوں سے آنکھیں سینکنا اور رگ و پے میں تناؤ کی لہریں دوڑانا محبوب مشغلہ جانتے ہوں۔

بہت سے لوگ عمر بھر دل اور آنکھوں میں کسی حسین کی شبیہ اور پہلو میں ان چاہی زوجہ اور درجن بھر بچے لیے گھومتے ہیں، لیکن محبت کے کھلے عام اظہار کو ثقافت و روایات کے منافی خیال کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک تو محبت سے جڑے اظہار و افعال بھی شجر ممنوعہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے بچوں پر بھی ایک عرصہ تک یہ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں کہ ایک دن گھر کے آنگن میں ایستادہ درخت سے لٹکے بچے توڑ کر انھوں نے پال لیے ہیں۔ یہ کہانی اس وقت تک چلتی رہتی ہے جب تک بچے خود نہ ٹوک دیں کہ ہم میں سے کوئی معمول کے مطابق بھی پیدا ہوا تھا یا نہیں؟

ہم گھر پر موجود ہوتے ہوئے بھی اپنے بچوں سے دروازے یا فون پر جھوٹ کہلوا سکتے ہیں کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے سامنے لوگوں کی غیبت، برائیاں کر سکتے ہیں، لوگوں کے خلاف سازشیں رچ سکتے ہیں لیکن محبت نہیں کر سکتے۔ ہم صنفی امتیاز، منفی انداز فکر، بے جا احساس تفاخر اور شقاوت قلبی تو اپنے بچوں کو سکھا سکتے ہیں لیکن محبت کرنا نہیں سکھا سکتے۔

حمیرا اشرف

اکبر معصوم کی چار غزلیں

ضروری نہیں خودکشی کیجیے
ہماری طرح زندگی کیجیے

نہیں عشق آساں تو الجھن ہے کیا
جو سب کر رہے ہیں وہی کیجیے

کسی ماہ رو سے لپٹ جایئے
ذرا روح میں چاندنی کیجیے

یہاں لڑکیاں بھی ہیں اور پیڑ بھی
یہاں بیٹھ کر شاعری کیجیے

کبھی دل کو پانی جگر کو لہو
ہمارے لیے آپ بھی کیجیے

وہ نازک بہت ہے سو ہدیہ اسے
گل خواب کی پنکھڑی کیجیے

در دیوار دریچہ اس کا
گھر اس کا باغیچہ اس کا

ہم تو ہیں بس خاک برابر
سارا اونچا نیچا اس کا

روز ہماری مٹی اوپر
بچھتا ہے غالیچہ اس کا

دل میں اس کی شکل اتاری
منظر آنکھ سے نیچا اس کا

جو بھی ڈھنگ سے بازی کھیلے
دنیا ہے بازیچہ اس کا

نہ اپنا نام نہ چہرہ بدل کے آیا ہوں
کہ اب کی بار میں رستہ بدل کے آیا ہوں
وہ اور ہوں گے جو کار ہوس پہ زندہ ہیں
میں اس کی دھوپ سے سایہ بدل کے آیا ہوں
ذرا بھی فرق نہ پڑتا مکاں بدلنے سے
وہ بام و در وہ دریچہ بدل کے آیا ہوں
مجھے خبر ہے کہ دنیا بدل نہیں سکتی
اسی لیے میں چشمہ بدل کے آیا ہوں
وہی سلوک وہی بھیک چاہتا ہوں میں
وہی فقیر ہوں کاسہ بدل کے آیا ہوں
مجھے بتاؤ کوئی کام پھر سے کرنے کا
میں اپنا خون پسینہ بدل کے آیا ہوں
میں ہوگیا ہوں کسی نیند کا شراکت دار
میں اک حسین کا تکیہ بدل کے آیا ہوں
سنو کہ جونک لگائی ہے میں نے پتھر میں
میں اک نگاہ کا شیشہ بدل کے آیا ہوں
مرا طریقہ مرا کھیل ہی نرالا ہے
نہ میں زبان نہ لہجہ بدل کے آیا ہوں
وہی اسیر ہوں اور ہے مری وہی اوقات
میں اس جہان میں پنجرہ بدل کے آیا ہوں

شعلۂ گل نہ آتش رخسار
اب تو سچ مچ کی آگ ہے درکار
دل میں چلنے لگی ہے باد خزاں
تو کہاں ہے خدائے باغ و بہار
قیس جاتا ہے اپنے گھر کی طرف
دیکھ اٹھتا ہے آئینے سے غبار
بیچتا ہوں گل ہزارۂ جاں
اور قیمت ہے صرف سو دینار
آ گئی نیند سو گئے سب لوگ
کھل گیا شہر خواب کا بازار

اشاروں کی زبان

ایلین اور سیگال

زیرِنظر مضمون کا موضوع میکسم گورکی نے تجویز کیا تھا۔ اس نے کہا، ''معلوم ہے آپ کو میں یہ کتاب کیسے شروع کرتا؟ تصور کیجیے؛ لامحدود خلا، ستارے، کہر، کہیں زبردست کہر کی گہرائی میں سورج روشن ہوتا ہے۔ سورج سے سیارے الگ ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے سیارے پر مادہ جاندار ہوجاتا ہے اور اپنا شعور حاصل کرنا شروع کرتا ہے۔ انسان نمودار ہوتا ہے۔''

۱۹۳۶ میں مصنفین نے اس بیانیہ پر کام کرنا شروع کیا کہ انسان کیسے نمودار ہوا، اس نے کام کرنا اور دماغ سے کام لینا کیسے سیکھا، کیسے اس نے آگ اور لوہے پر قدرت حاصل کی، کیسے اس نے فطرت پر اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کی، کیسے اس نے دنیا کا علم حاصل کیا اور اس کی از سرِنو تعمیر کی۔ زیرِنظر مضمون اسی تحقیقی تصنیف ''انسان کیسے بڑا بنا'' کے ایک باب کو یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔

ماقبل تاریخ کے آدمی کے پاس بھی بولنے کے لیے الفاظ نہ تھے، لیکن ہاتھ تھے جو اسے اپنی بات سمجھانے میں مدد دیتے تھے۔ یہ کہنے کی بجائے کہ ''اس کو کاٹ دو''، ماقبل تاریخ کا آدمی ہاتھ سے ہوا کو کاٹ کر یہ بات بتاتا تھا۔ ''مجھ کو دو'' کہنے کی بجائے وہ اپنا ہاتھ پھیلا دیتا تھا، ''یہاں آؤ'' کہنے کی بجائے وہ اپنے ہاتھ اپنی طرف ہلاتا تھا۔ ہاتھوں کی مدد کے لیے وہ آواز بھی استعمال کرتا تھا۔ وہ دوسرے آدمیوں کو متوجہ کرنے اور اپنے ہاتھ کے اشاروں کو دیکھنے پر مجبور کرنے کے لیے گرجتا، غراتا یا شور مچاتا تھا۔

لیکن ہمیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟

جو بھی ٹوٹا ہوا پتھر کا اوزار ہمیں ملتا ہے، وہ ماضی کا ایک جز ہے لیکن ہمیں اشاروں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے کہاں مل سکتے ہیں؟ ہم ان ہاتھوں کے اشاروں کو کیسے بحال کرسکتے ہیں جو مدتوں ہوئے خاک میں مل چکے ہیں؟

یہ بات ناممکن ہوتی اگر ماقبل تاریخ کے لوگ ہمارے اجداد نہ ہوتے اور ہمارے لیے ترکہ نہ چھوڑ

گئے ہوتے۔

بولتے ہوئے ہاتھ

تھوڑے ہی دن ہوئے ایک امریکی انڈین لینن گراد سے آیا تھا۔ وہ ''نیز پیرس'' قبیلے کا آدمی تھا جس کے معنی ہیں ''چھدی ہوئی ناک''۔ اس انڈین کے پاؤں میں تو ہرن کی کھال کے جوتے (Moccasins) تھے اور نہ ٹوپی میں چڑیوں کے پر۔ وہ عام یورپی لباس پہنے تھا اور انگریزی اور اپنی قبائلی زبان دونوں روانی سے بولتا تھا۔ ان دو زبانوں کے علاوہ وہ تیسری زبان بھی جانتا تھا جو انڈین لوگوں میں ہزار ہا سال سے محفوظ ہے۔

یہ دنیا کی سب سے سادہ زبان ہے۔ اگر تم اسے سیکھنا چاہو تو تمھیں افعال کی گردان اور اسم و صفت وغیرہ کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہوگی جو ہمارے لیے دردِ سر ہوتے ہیں۔ صحیح تلفظ کی مہارت پیدا کرنا کافی آسان بات ہوگی، کیوں کہ تمھیں کسی لفظ کو ادا کرنا ہی نہ پڑے گا۔

تیسری زبان جو ہمارا ملاقاتی بولتا تھا، وہ آوازوں کی نہیں اشاروں کی زبان تھی۔ غالباً اس زبان کی لغت کچھ اس طرح کی ہوگی۔

اشاروں کی زبان کی لغت کا ایک صفحہ

کمان: ایک ہاتھ خیالی کمان پکڑے ہے اور دوسرا ہاتھ اس کی تانت کھینچ رہا ہے۔

وِگوام: (امریکی انڈینوں کا خیمہ) ایک دوسرے میں جڑی ہوئی انگلیاں خیمہ دکھاتی ہیں۔

گورا آدمی: پیشانی کے اوپر رکھا ہوا ہاتھ جو ہیٹ کے چھجے کے لیے اشارہ ہے۔

بھیڑیا: ہاتھ کی دو اٹھی ہوئی انگلیاں جو دو کانوں کی شکل رکھتی ہیں۔

خرگوش: اوپر کی طرح ہاتھ کی دو اٹھی ہوئی انگلیاں اور ایک حلقہ بنانے ولا اشارہ۔ یہ خرگوش کے دو اٹھے ہوئے کان اور اس کی گول پیٹھ کے لیے اشارہ ہے۔

مچھلی: ملی ہوئی انگلیوں کے ساتھ ہاتھ کے ٹیڑھے میڑھے چلنے کا اشارہ جیسے مچھلی تیرتی ہے اور اس کی دُم دائیں بائیں چلتی رہتی ہے۔

مینڈک: ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے سرے ایک بار ملے ہوئے، پھر الگ پھدکنے کی حرکت کے ساتھ۔

بادل: دونوں مٹھّیاں سر کے اوپر بادل دکھاتی ہیں۔

برف: اوپر کی طرف دو مٹھّیاں سر کے اوپر لیکن انگلیاں رفتہ رفتہ کھلتی ہیں اور برف کے گالوں کی طرح ناچتی ہوئی آتی ہیں۔

بارش: اوپر کی طرح مٹھّیاں جو پھیلتی ہیں اور تیزی سے نیچے جاتی ہیں۔

تارہ: دو انگلیاں ملی ہوئی اور پھر الگ سر کے اوپر کافی اونچی جیسے ستارہ جھلملا رہا ہو۔

اس زبان کا ہر لفظ ہوا میں کھینچی جانے والی تصویر ہے۔ جیسے کہ بہت ہی قدیم تحریریں بھی الفاظ میں نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ تصویروں میں ہیں، اسی طرح شاید بہت ہی قدیم اشارے بھی تصویری اشارے تھے۔

ظاہر ہے کہ موجودہ انڈین قبیلوں کی اشاروں کی زبان تو ماقبل تاریخ کے انسان کی زبان نہیں تھی۔ موجودہ انڈین قبیلوں کی اشاروں کی زبان میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو کسی ماقبل تاریخ کی زبان میں نہیں ملیں گے۔ یہ حال کے تصویری اشارے ہیں، مثلاً:

موٹر: دو پہیے دکھانے کے لیے ہاتھوں سے دو حلقے بنانا اور خیالی اسٹیرنگ کا گھمانا۔

ٹرین: پہیوں کو دکھانے کے ہاتھوں کے دو حلقے بنانا اور پھر ہاتھ سے لہراتا ہوا اشارہ انجن کی بھاپ کو اوپر جاتے ہوئے دکھانے کے لیے۔

یہ بہت ہی نئے اشارے ہیں لیکن اشاروں کی زبان میں ایسے لغت والے اشارے بھی ہیں جو ماقبل تاریخ کے ہیں، مثلاً:

آگ: ہاتھ کا اوپر کی طرف لہراتا ہوا اشارہ کسی پڑاؤ کے الاؤ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دکھانے کے لیے۔

کام: ہاتھ سے کاٹنے کا اشارہ۔

کون جانتا ہے شاید ماقبل تاریخ کا آدمی جب ''کام'' کہنا چاہتا ہوگا تو ہاتھ سے ہوا کاٹتا ہوگا۔ بہر حال پتھر کا پہلا اوزار تو بسولی تھی۔

ہماری اپنی اشاروں کی زبان

ہم نے بھی اپنی اشاروں کی زبان محفوظ رکھی ہے۔

جب ہم 'ہاں' کہنا چاہتے ہیں تو ہمیشہ بولتے نہیں بلکہ سر ہلا دیتے ہیں۔ جب ہم 'وہاں' کہنا چاہتے ہیں تو کبھی کبھی اس طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ ہمارے ایک مخصوص ''بولنے والی انگلی'' ہے، جس کو ہم اشارے کی انگلی کہتے ہیں۔

جب ہم کسی کو سلام کرتے ہیں تو جھکتے ہیں۔ ہم اپنا سر ہلاتے ہیں، شانے جھٹکتے ہیں، اپنے بازو اٹھاتے ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں، پیشانی پر بل ڈال کر گھورتے ہیں، اپنے ہونٹ کاٹتے ہیں، کسی پر انگلی ہلاتے ہیں، میز پر ہاتھ یا مکا مارتے ہیں، پیر پٹکتے ہیں، ہاتھ ہلاتے ہیں، اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہیں، اپنے بازو بڑھاتے ہیں، اپنا ہاتھ دیتے ہیں اور دور سے چومتے ہیں۔ یہاں ایسی پوری گفتگو ہوتی ہے جس میں ایک لفظ بھی نہیں بولا جاتا اور یہ ''بن بولی زبان'' اشاروں کی زبان مرنا نہیں چاہتی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس میں بعض

خوبیاں بھی ہیں۔ کبھی کبھی ایک اشارہ بھی کسی طویل گفتگو سے زیادہ مطلب کا اظہار کر جاتا ہے۔ کوئی اچھا ایکٹر خاموش رہنے کے باوجود اپنے چشم وابرو اور ہونٹوں کے ذریعے آدھ گھنٹے کے اندر سینکڑوں الفاظ ادا کر دیتا ہے۔

بہرحال اشاروں کی زبان ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تم کوئی بات اپنے ہاتھوں یا پاؤں سے کیوں ادا کرو، جب کہ تم اس کو آسانی سے الفاظ میں کہہ سکتے ہو۔ ہم کوئی ماقبل تاریخ کے آدمی تو ہیں نہیں۔ پیروں کو پٹکنا، چیزوں کو اشاروں سے بتانا اور ہاتھوں کو ہلانا ایسی عادتیں ہیں جن کو بھول ہی جانا اچھا ہے۔

پھر بھی کبھی کبھی صرف اشاروں کی زبان ہی ہماری ترجمانی کر سکتی ہے۔ کبھی تم نے دو جہازوں کو جھنڈوں کے سگنلوں کے ذریعے باتیں کرتا دیکھا ہے۔ ہوا، لہروں اور توپوں کی گرج کے شور کے اوپر آدمی کے لیے آواز پہنچانا ناممکن ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمارے کان کام نہیں دیتے اور ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔

تم غالباً اشاروں کی زبان اکثر استعمال کرتے ہو، مثلاً جب کلاس روم میں استاد کی توجہ اپنی طرف کرنا چاہتے ہو تو ہاتھ اٹھا دیتے ہو اور یہ ٹھیک بھی ہے، کیوں کہ تم سوچ سکتے ہو کہ اگر ایک ساتھ تیس چالیس بچے بولنا شروع کر دیں تو کیا حالت ہوگی؟

لہٰذا، ہم دیکھتے ہیں کہ اشاروں کی زبان کی اپنی خوبیاں ہیں اور اس وجہ سے وہ ہزار ہا سال تک زندہ رہی ہے اور اب بھی اس کی ضرورت ہے۔

بولی، اشاروں کی زبان پر حاوی ہوگئی ہے لیکن مکمل طور پر نہیں۔ اب مفتوح فاتح کی لونڈی بن گئی۔ اس لیے کچھ قوموں میں اشاروں کی زبان کا وجود نوکروں، ماتحتوں اور ان لوگوں کی زبان کی حیثیت سے رہ گیا ہے جو کمتر سمجھے جاتے ہیں۔

اکتوبر کے عظیم سوشلسٹ انقلاب سے پہلے قفقاز کے آرمینیائی دیہاتوں میں عورت کو اپنے شوہر کے علاوہ کسی مرد سے بولنے کی اجازت نہ تھی۔ جب کسی دوسرے آدمی سے اسے کچھ کہنا ہوتا تو اس کو اشاروں کی زبان استعمال کرنا پڑتی۔

شام، ایران اور دنیا کے بہت سے دوسرے حصوں میں اشاروں کی زبان تھی، مثلاً ایران کے محل میں ملازمین کو صرف اشاروں کی زبان استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ وہ صرف اپنے برابر والوں سے الفاظ میں بات چیت کر سکتے تھے۔ یہ بدقسمت لوگ واقعی ''آزادیٔ تقریر'' سے محروم تھے۔

جنگل میں ہر جانور ان ہزار سگنلوں کو سنتا ہے جو اس کو چاروں طرف سے پہنچتے ہیں اور ان سے چوکنا رہتا ہے۔ ایک ٹہنی چرچرائی؛ ممکن ہے دشمن ہو اور جانور بھاگنے یا اپنی مدافعت کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ زور کی گرج ہوتی ہے، ہوا جنگل کے درختوں کو چیرتی، شاخوں کی پتیاں بکھیرتی ہوئی چلتی ہے۔ جانور طوفان

سے بچنے کے لیے اپنے گھونسلوں یا بھٹوں میں چھپ جاتے ہیں۔ جب سڑتی ہوئی پتیوں اور کھمبیوں کی مہک کے ساتھ مل کر شکار کی بُو نم زمین پر پھیلتی ہے تو جانور اس بُو کے ذریعے شکار کا پیچھا کرتا ہے۔ ہر سرسراہٹ، ہر بُو، گھاس میں ہر نشان، ہر چیخ یا سیٹی کچھ نہ کچھ معنی رکھتی ہے اور اس کی طرف فوراً توجہ کرنی چاہیے۔ ماقبل تاریخ کا آدمی بھی بیرونی دنیا کے سگنل سنا کرتا تھا۔ بہرحال اس نے دوسرے قسم کے سگنلوں کو بھی سمجھنا جلد ہی سیکھ لیا۔ یہ ایسے سگنل تھے جو اس کے جرگے کے لوگ اس کو دیتے تھے۔ مثلاً ماقبل تاریخ کا کوئی شکاری جنگل میں کسی بارہ سنگھے کے نشانات دیکھتا تو وہ ہاتھ ہلا کر دوسرے شکاریوں کو اس کے بارے میں سگنل دیتا۔ دوسرے شکاری جانور کو نہیں دیکھتے تھے لیکن سگنل سے چوکس ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے اسلحہ کو زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے جیسے کہ انھوں نے خود بارہ سنگھے کی بڑی بڑی سینگیں اور چوکنے کان دیکھ لیے ہوں۔

اسی طرح بولی بھی ایک سگنل بن گئی، ان سگنلوں کے علاوہ جو قدرت نے آدمی کو عطا کیے تھے، ایسا سگنل جس کے ذریعے ایک جرگے کے ممبر ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ مشہور روسی سائنس داں ایوان پاولوف نے اپنی ایک تصنیف میں انسانی بولی کو ''سگنلوں کے بارے میں سگنل'' کہا ہے۔

پہلے تو یہ سگنل صرف آوازوں اور اشاروں ہی کی صورت میں تھے۔ ان کو آدمی کی آنکھیں اور کان موصول کرتے تھے اور ان کو دماغ کی طرف اس طرح بھیج دیتے تھے جیسے کوئی سگنل مرکزی ٹیلی فون اسٹیشن کو جاتا ہے۔ جب دماغ کو ''سگنلوں کے بارے میں سگنل'' ملتا، مثلاً ''جانور آ رہا ہے'' تو دماغ فوراً حکم دیتا: ہاتھو! تم اپنا بھالا مضبوطی سے پکڑ لو۔ آنکھو! جھاڑیوں کی طرف اچھی طرح نگراں رہو۔ کانو! ہر سرسراہٹ اور ٹہنیوں کی چرچراہٹ کی آواز سنو۔ جانور ابھی آنکھ اور نشانے کی زد سے دور ہوتا لیکن شکاری اس کے لیے تیار ہو جاتا۔

اشارات اور جذبات میں جتنا اضافہ ہوتا گیا، اتنے ہی اکثر ''سگنلوں کے بارے میں سگنل'' دماغ کو پہنچنے لگے اور ''مرکزی اسٹیشن'' کا کام بڑھنے لگا جو انسانی کھوپڑی کے پیشانی والے سرے میں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ''مرکزی اسٹیشن'' میں توسیع ہوتی رہنی چاہیے۔ دماغ کے خلیے برابر بڑھتے گئے اور ان کے درمیان سلسلے زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے۔ دماغ خود زیادہ بڑا ہوگیا۔ نینڈر تھل آدمی کا دماغ Pithecanthropus کے دماغ سے چار پانچ سو مکعب سنٹی میٹر زیادہ بڑا ہوتا تھا۔ ماقبل تاریخ کے آدمی کا دماغ جتنا بڑھتا گیا، اتنا زیادہ وہ سوچنے لگا۔

جب وہ کوئی ایسا سگنل دیکھتا یا سنتا جس کا مطلب ''سورج'' ہوتا تو وہ سورج کے بارے میں سوچتا، چاہے اس وقت آدھی رات ہی کیوں نہ ہوتی۔

مشترکہ کام نے آدمی کو بولنا سکھایا اور جب اس نے بولنا سیکھ لیا تو سوچنا بھی سیکھا۔ آدمی کو اس کا دماغ قدرت سے بطور تحفہ نہیں ملا، اس نے اس کو اپنے ہاتھوں کی محنت سے حاصل کیا ہے۔

ہاتھوں کی جگہ زبان نے کیسے لی؟

جب بہت کم اوزار تھے اور ماقبل تاریخ کے آدمی کا تجربہ بھی بہت محدود تھا، تب انتہائی سادہ اشارے بھی ایک دوسرے کو ہنر سکھانے کے لیے کافی تھے۔ لیکن آدمی کا کام جتنا پیچیدہ ہوتا گیا، اس کے اشارے بھی اتنے ہی پیچیدہ ہوتے گئے۔ ہر چیز کے لیے ایک خاص اشارہ ضروری ہوگیا۔ اس اشارے کو چیز کی وضاحت بالکل ٹھیک ٹھیک کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح تصویری اشاروں کا وجود ہوا۔ آدمی جانوروں، اوزاروں اور دوسری چیزوں کی تصویریں ہوا میں بنانے لگا۔ وہ دوسروں کو دکھاتا کہ خار پشت کیسے زمین کھودتی ہے اور اس کو پنجوں سے ہٹاتی ہے، اس کے کانٹے کیسے نوکیلے ہوتے ہیں۔ اس کہانی کا اظہار خاموش حرکات و سکنات کے ذریعہ کرنے کے لیے ماقبل تاریخ کے آدمی کو بہت ہی نگراں رہنا پڑتا تھا، بالکل ہمارے زمانے کے سچے فن کار کی طرح۔

جب تم یہ کہتے ہو کہ ''میں نے پانی پیا'' تو جس شخص کو یہ بتا رہے ہو، اس کو تمھاری بات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تم نے کسی گلاس، بوتل یا ہاتھ کے چلو سے پیا۔ وہ آدمی جو اشاروں کی زبان جانتا ہے، اس بات کو دوسرے طریقے سے کہے گا۔ وہ اپنے ہاتھ کا چلو منھ تک لائے گا اور خیالی پانی پیے گا۔ جو لوگ اس کو دیکھیں گے، وہ سمجھ سکیں گے کہ پانی کتنا مزیدار، ٹھنڈا اور تازگی بخشنے والا تھا۔

ہم صرف ''شکار'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن ماقبل تاریخ کا آدمی شکار کے پورے منظر کو ادا کر کے دکھاتا ہے۔ اشاروں کی زبان بیک وقت پُرمعنی اور محدود بھی ہوتی ہے۔ یہ پُرمعنی ہوتی تھی، کیوں کہ یہ واقعہ یا چیز کی بہت ہی صاف تصویر کشی کرتی تھی لیکن یہ محدود بھی تھی۔ اشاروں کی زبان میں تم اپنی دائیں یا بائیں آنکھ کے بارے میں بتا سکتے تھے لیکن صرف ''آنکھ'' بتانا بہت مشکل تھا۔ تم کسی چیز کو بتانے کے لیے اشارے استعمال کر سکتے تھے لیکن کوئی اشارہ کسی مجرد خیال کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

اشاروں کی زبان میں دوسری خامیاں بھی تھیں۔ اشاروں کی زبان میں تم رات میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، کیوں کہ رات کے اندھیرے میں چاہے جتنے زوردار اشارے کیے جائیں، وہ دیکھے نہیں جا سکتے۔ اس کے علاوہ دن کی روشنی میں بھی لوگ ایک دوسرے کے اشارے کبھی کبھی نہیں سمجھ پاتے تھے۔ میدانوں میں لوگ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے سے اشاروں کی زبان میں بول سکتے تھے لیکن جنگل میں جب شکاری ایک دوسرے سے گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے الگ ہو جاتے تھے تو یہ ناممکن ہوتا تھا۔

اب لوگوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے آواز کا استعمال کریں۔ پہلے پہل تو ماقبل تاریخ کے آدمی کی زبان اور گلا بہت ہی نافرمانبردار تھے۔ ایک آواز اور دوسری آواز میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ الگ آوازیں مل کر کوئی غراہٹ، غل یا چیخ بن جاتی تھیں۔ زبان سے صاف الفاظ ادا کرنے میں آدمی کو بہت زمانہ لگ گیا۔ زبان کی حرکتیں ایسے اشارے تھیں جو سب سے کم نظر آتے تھے لیکن ان کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ سنے جا سکتے تھے۔

ابتدا میں باآواز بات چیت اشاروں کی زبان سے بہت مشابہ تھی۔ وہ ابھی اسی طرح تصویروں

کی زبان تھی اور اسی طرح بہت صفائی اور سچائی سے ہر چیز اور ہر حرکت کی تصویر کشی کرتی تھی۔ ایک قبیلے کے لوگ صرف ''چلنا'' نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں: سنبھل کر چلنا، بھاری پن سے موٹے آدمیوں کی طرح چلنا، تیزی سے دوڑنا، لڑکھڑا کر چلنا، ہلکے سے لنگڑا کر اور سر آگے جھکا کر چلنا وغیرہ۔ ان میں سے ہر جملہ صوتی تصویر ہے جو آوازوں میں ایک شخص کی چال کی ہر تفصیل بتاتا ہے۔ ان میں سنبھل کر قدم رکھنا، لمبے آدمی کے بڑے بڑے ڈگ اور اس آدمی کے قدم ہیں جو اپنے گھٹنے ذرا بھی نہیں جھکاتا۔ جتنی چالیں ہیں، اتنی ہی طرح کے جملے ان کے اظہار کے لیے ہیں۔ غرض اس طرح تصویری نشان کی جگہ صوتی نشان نے لے لی اور اس طرح ماقبل تاریخ کے انسان نے اشاروں اور الفاظ میں باتیں کرنا سیکھا۔

لوگوں میں ایک غلط فہمی عام ہے کہ بھارت میں صرف مسلمان ہی ہیں، جو گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ یہ ایک بالکل بے بنیاد سوچ ہے، کیوں کہ اس کا کوئی تاریخی حوالہ موجود نہیں ہے۔ البتہ ویدک لٹریچر میں ایسی کئی مثالیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی گائے کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ جب یگیہ ہوتا تھا، تب بھی 'گئو ونش' کی بلی دی جاتی تھی۔ اس وقت یہ بھی رواج تھا کہ اگر مہمان آجائے یا کوئی خاص شخص آجائے تو اس کے استقبال میں گائے کی بلی دی جاتی تھی۔

شادی کی تقریبات میں یا پھر 'گرہیہ پرویش' کے وقت بھی گائے کا گوشت کھانے کھلانے کا رواج عام تھا، یہ گپت عہد سے پہلے کی بات ہے۔ 'گئو ہتیا' پر کبھی پابندی عائد نہیں رہی، لیکن پانچویں صدی عیسوی سے چھٹی صدی عیسوی کے آس پاس چھوٹی چھوٹی ریاستیں بننے لگیں اور 'بھومی دان' دینے کا رواج شروع ہوا۔ لہٰذا کاشت کاری کے لیے جانوروں کی اہمیت بڑھتی گئی، بطور خاص گائے کی اہمیت بڑھی۔ بعد ازاں 'دھرم شاستروں' میں ذکر آنے لگا کہ گائے کو نہیں مارنا چاہیے۔

رفتہ رفتہ گائے کو نہ مارنا ایک آئیڈیالوجی بن گئی۔ پانچویں چھٹی صدی عیسوی تک دلتوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس وقت برہمنوں نے 'دھرم شاستروں' میں یہ بھی لکھنا شروع کر دیا کہ جو گائے کا گوشت کھاتا ہے، وہ دلت ہے۔ اسی دوران سزا کا تعین بھی عمل میں آیا، اس کے باوجود ایسا کوئی قانون نہیں تھا کہ گئو ہتیا کرنے والے کی جان لے لی جائے، جیسا کہ آج کچھ لوگ کر رہے ہیں۔ سزا کے طور پر صرف اتنا طے کیا گیا کہ گئو ہتیا کرنے والے کو برہمنوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔

سارا تنازعہ ۱۹ویں صدی میں شروع ہوا جب آریہ سماج کی تشکیل ہوئی اور سوامی دیانند سرسوتی نے 'گئو رکشا' کے لیے تحریک چلائی، اس کے بعد ہی ایسا مان لیا گیا کہ جو گائے کا گوشت بیچتا اور کھاتا ہے، وہ مسلمان ہے۔

ڈی این جھا (مورخ)

بی بی سی (ہندی)، ۱۵ اپریل ۲۰۱۵

چھ مراٹھی نظمیں

ترجمہ: وقار قادری

وقار قادری کے تراجم خواہ وہ نظم کے ہوں یا مراٹھی افسانے، ان سے یہ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اردو زبان کی طرح مراٹھی زبان پر بھی قدرت رکھتے ہیں، اس لیے ان کے تراجم میں تاثر کا عنصر اسی مقدار میں شامل رہتا ہے جو حقیقی فن پارے نے اپنے قاری پر چھوڑا تھا۔ مراٹھی کے چند نئے شاعروں کی نظموں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے جو وقار قادری نے مراٹھی سے براہ راست اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو نظم مراٹھی کی نظموں کے اس لب و لہجے اور ایسے موضوعاتی تنوع سے بڑی حد تک خالی ہے۔

وقار قادری ''دلت کتھا'' کے نام سے نمائندہ مراٹھی دلت کہانیوں کا ترجمہ کر کے ساہتیہ اکادمی کا ترجمہ ایوارڈ پا چکے ہیں۔

زبیر رضوی، ''گفتگو بند نہ ہو'' (مراٹھی نظموں کے تراجم)

انجلی کلکرنی

میں: دنیا کی
لنگ: عورت
نام: محترمہ فلاں فلاں
عمر: فلاں
رنگ روپ، اونچائی، وزن: فلاں فلاں فلاں وغیرہ
نوکری: ظاہر ہے کلرک کی فلاں جگہ
مشاغل: گھریلو کام، سینا پرونا، صاف ستھرا پن، کھانا بنانا
خصوصیات: بیوٹی شین کا کورس، نوکری، بچے بالے، گھر سنسار، عزیز و اقارب
سسرال، میکہ، شادیاں و دیگر تقریبات
پوجا پاٹھ، اُپاس (روزے)، ٹیسٹ (میڈیکل)

پرانی نظموں کو تھرڈ ڈگری

گنیش وسئیکر

ایک بار میں نے اپنی پرانی نظموں کو
تھرڈ ڈگری دینے کا ارادہ کیا
میلے کچیلے کپڑوں میں
داڑھی بڑھے شبدوں کو
ریمانڈ پر لینے کے بعد
بہت مارا
برف کی لادی (سل) پر اوندھا لٹا کر
اس کے گندے کولھوں پر
کالی نیلی نفرت بھری نظر سے
نئی نظموں کے بخیے ادھیڑ دیے
ان کی کائی زدہ، خون سے لت پت
آتما دیکھنے کے لیے
نمک کے پانی میں ڈبو کر
مقعد میں ٹائیگر بام گھسیڑ کر
میرے کاٹنے والے پنجرے میں
ان کی چیخیں گونج رہی ہیں
ایک آدھ بار انھیں
چھوڑ بھی دوں میں پے رول پر
انکاؤنٹر کرنے کے لیے!!

کوڑا اٹھانے والا کرین

چیتن ودیہ

ہاں یہ اس نے سچ کہا
technology has brought equality
کوڑا اٹھانے والے کرین کو
اب کوئی
شودر، مہار یا بھنگی کہہ کر
ذلیل نہیں کرتا

ایک نظم

سریتا پڈکی

فٹ پاتھ پر پڑے کسی پتھر کو
جب بھی کوئی پہلا شخص
سیندور لگا تا نظر آئے
جان پر کھیل کر اس کو روکو
کیوں کہ اکثر پتھر خدا بن جاتے ہیں

قحط

پردیپ ادھیکاری

گھر کے راستے پر کھڑے
چاروں درخت
ٹکر ٹکر اس کی راہ دیکھ رہے تھے
ان کے جھڑے ہوئے پتوں کی چھاؤں میں
بیٹھے بیلوں کے جسم پر
خالص ہڈیاں بچی ہیں
اونچی شاخ پہ گدھ بیٹھے ہیں
اس کے گھر آنے سے پہلے
گھر آنگن میں
ارتھی تیار رکھی ہے
بابا کے مردہ جسم پر
اک چادر پڑی ہے
مردے کی مائنتی بیٹھی عورت

دھائیں دھائیں رو رہی ہے
طویل انتظار سے تھکے لوگ
سہمے ہوئے سے آگے بڑھے
خاکی وردی والے نے ایک فائل بڑھا دی
موت کا کارن 'خودکشی'
اتنا پڑھ کر اس نے سائن (دستخط) کر دی
عورتوں کے رونے دھونے کی آوازوں میں
ارتھی اٹھی

سر کے بال منڈا کر
گنجے سر میں جلن لیے
میت سے وہ گھر لوٹ آیا
گھر میں نہانے کو پانی کا قطرہ نہ تھا
چھوٹا سہمے ہوئے بولا
''دادا! ٹینکر (پانی کا) تو کل آئے گا۔''

چیونٹی

سریش پا چکوڑے

کاغذ پر پھیلے سیاہ شبدوں پر
ایک سیاہ چیونٹی آ بیٹھی ہے
اور ان لاتعداد حرفوں کو
چیونٹیوں کی بھیڑ جان کر
راستہ بھٹک گئی ہے
صفحے پر سارے حرف ساکت ہیں
چیونٹی سمجھی
یہ ساری چیونٹیاں مری پڑی ہیں
کچھ دیر تو وہ چیونٹی
اس بھیڑ میں ساکت پڑی رہی
پھر ان مری پڑی چیونٹیوں میں
شامل ہو گئی!!

ملحد کا اوورکوٹ

برٹولٹ بریخت

ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی

یہ ۱۶۰۰ عیسوی کی بات ہے کہ چرچ کا محکمۂ انکوئیزیشن (Inquisition) گیارڈنو برونو کو، اس کے ملحدانہ خیالات کی وجہ سے زندہ آگ میں جلانا چاہتا تھا۔ برونو محض اس لیے ہی عظیم انسان نہیں تھا کہ اس نے ستاروں کی گردش کو سچ ثابت کیا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ اس نے بڑی جرأت اور بہادری کے ساتھ انکوئیزیشن کی عدالت میں اپنا مقدمہ لڑا تھا اور ان سے مخاطب ہو کر یہ تاریخی الفاظ کہے تھے: ''تم میرے خلاف یہ فیصلہ ڈر اور خوف کے ساتھ دے رہے ہو۔''

جب بھی کوئی اس کی تحریروں کو پڑھتا ہے، اور ان رپورٹوں پر نظر ڈالتا ہے جو اس کے خلاف مقدمہ کے دوران لکھی گئیں، تو اسے ایک بڑا آدمی تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے متعلق ایک اور واقعہ بھی ہے جس کی وجہ سے ہماری نظروں میں اس کی عزت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ واقعہ اس کے اوورکوٹ کا ہے۔

لیکن پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر وہ انکوئیزیشن کے ہاتھوں گرفتار کیسے ہوا؟

وینس کے ایک امیر جس کا نام موچے نیگو تھا، اسے ایک مرتبہ اپنے گھر پر بلایا تا کہ وہ اس سے طبیعات اور دوسرے علوم پر اسباق لے سکے۔ لیکن ایک ماہ کے عرصہ میں اس نے جو کچھ اسے پڑھایا، موچے نیگو اس سے غیر مطمئن رہا۔ کیوں کہ اسے امید تھی کہ برونو اسے علم طبیعات کی بجائے کالے جادو کی تعلیم دے گا۔ اس لیے اس نے کئی بار اسے بڑے خلوص سے تنبیہ بھی کی وہ اسے پر اسرار اور فائدہ مند علم سکھائے، کیوں کہ اسے یقین تھا کہ برونو جیسا مشہور عالم اس علم سے ضرور واقف ہوگا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ برونو اس معاملہ میں اس کے لیے زیادہ فائدہ مند نہیں تو اس نے سوچا کہ کسی طرح اس معاوضہ ہی کو بچایا جائے جو پڑھائی کے عوض طے ہوا تھا، یہ ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اسے انکوئیزیشن کے سامنے ملزم ٹھہرایا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس خراب اور ناشکرے انسان نے اس کی موجودگی میں حضرت عیسیٰ کو برا بھلا کہا، اور

راہبوں و پادریوں کے بارے میں کہا کہ وہ گدھے ہیں، اور عوام میں سب سے زیادہ احمق ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے بائبل کی تعلیمات کے خلاف پڑھایا وغیرہ وغیرہ، اس کے ساتھ ہی موچے نیگو نے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا، اور انکوئیزیشن کے افسروں سے درخواست کی کہ وہ اسے آکر لے جائیں۔

اس کی رپورٹ پر انکوئیزیشن کے افسرات کو آئے اور اسے اپنے ساتھ جیل لے گئے۔ یہ واقعہ بروز پیر، صبح تین بجے، ۲۵ مئی ۱۵۹۲ عیسوی کو ہوا۔ اس دن سے جب اسے گیارہ فروری ۱۶۰۰ عیسوی کو ایندھن کے ڈھیر پر زندہ جلانے کے لیے لایا گیا، وہ جیل سے باہر نہیں نکلا، ان ۸ سالوں میں جب وہ مقدموں کی اذیتوں سے گذرا، وہ بغیر کسی کمزوری کے اپنی زندگی کے لیے لڑتا رہا۔ لیکن ایک مہینہ جو اس نے وینس میں اپنا دفاع میں گذارا، صرف اس وقت وہ اپنا دفاع تندہی سے نہ کر سکا، کیوں کہ اسی دوران اوورکوٹ کا واقعہ پیش آیا۔

۱۵۹۲ عیسوی کی سردیوں میں جب وہ کرایہ کے ایک کمرے میں رہتا تھا، اس نے شہر کے ایک درزی جس کا نام جبریل سنتو تھا، اپنے لیے ایک موٹے اوورکوٹ کا ماپ دیا تھا، کوٹ ملنے کے بعد ہی اسے گرفتار کر لیا گیا، یہ وقت تھا جب وہ اس کی قیمت ادا نہیں کر سکا تھا۔

درزی نے جیسے ہی اس کی گرفتاری کی خبر سنی تو وہ بھاگا ہوا موچے نیگو کے مکان پر پہنچا، تاکہ اپنی رقم وصول کر سکے۔ لیکن وقت گذر چکا تھا، موچے نیگو کے گھر کے ایک خادم نے اسے دروازے پر ہی روک دیا اور کہا کہ ''اس دھوکا باز کو ہم پہلے ہی بہت دے چکے ہیں''، اس نے یہ الفاظ دروازے پر کھڑے کھڑے اتنے زور سے کہے کہ راستہ چلتے چند لوگ بھی رک گئے، ''بہتر یہ ہے کہ اس ملحد کے خلاف جو کچھ کہنا ہے، وہ مقدس عدالت کے سامنے جا کر کہو۔''

درزی ان الفاظ کو سن کر سکتہ میں آ گیا، اور اسی حالت میں تھوڑی دیر تک وہ گلی میں کھڑا رہا۔ گلی کے چند لڑکوں نے جنھوں نے اس گفتگو کو سنا تھا، ان میں سے ایک نے اسے نشانہ بنا کر پتھر پھینکا، اگرچہ اس پر ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک عورت نے اس لڑکے کے کان کھینچے لیکن اس سے سنتو کو فوراً اس بات کا احساس ہو گیا کہ شاید لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ اس کا بھی اس ملحد سے ضرور کوئی تعلق ہے۔ اس لیے وہ خاموشی سے تیز تیز چلتا ہوا اپنے گھر واپس ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کو اس حادثہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، اگرچہ اسے اپنے شوہر کی ہفتہ بھر کی خاموشی اور اداسی پر تعجب ضرور رہا۔

پہلی جون کو حساب لکھتے ہوئے اسے پتہ چلا کہ ایک اوورکوٹ کی قیمت ادا نہیں کی گئی اور یہ اوورکوٹ اس آدمی کے نام پر تھا جس کا نام اس وقت شہر کے بچے بچے کی زبان پر تھا اور اس کے بارے میں بری بری قسم کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ اس نے نہ صرف یہ کہ کتابیں لکھ کر اپنی عزت و آبرو مٹی میں ملائی بلکہ اپنی گفتگو میں مذہب کے خلاف بھی باتیں کہیں۔ اس لیے ایسے شخص سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے اوورکوٹ کی قیمت ادا نہ کرے گا۔ اس نیک عورت کی بالکل بھی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ اس بڑے نقصان کو برداشت کرے۔ اس لیے اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر یہ ۷۰ سالہ عورت اپنے اتوار کے کپڑوں میں مقدس عدالت کی عمارت جا پہنچی اور وہاں اس نے بڑی ناراضگی سے اپنے ۳۲ اسکوڈی (ایک قسم کا سکہ) کے لیے

مطالبہ کیا جو اس ملحد قیدی کے ذمہ تھے۔ ایک عہدیدار نے اس کے مطالبے کو لکھا اور وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کے چھان بین کرے گا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد سنتو کا مقدس عدالت سے بلاوا آ گیا، اس پر وہ غریب ڈر اور خوف سے کانپتا ہوا، اس ہیبت ناک عمارت میں جا پہنچا اور اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اسے تعجب ہوا کہ اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا گیا اور صرف یہ کہا گیا کہ قاعدے وقوانین کی رو سے اس کے قرض کے بارے میں قیدی کی مالی حالت دیکھ کر فیصلہ کیا جائے گا، ساتھ ہی عہدیدار نے اس سے یہ بھی کہا کہ اسے کسی خاص کامیابی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

بوڑھا آدمی اس طرح سے سستے چھوٹ جانے پر بڑا خوش ہوا، بلکہ اس نے عہدیدار کا خوشامدانہ انداز میں شکریہ بھی ادا کیا لیکن اس کی بیوی اس پر بالکل بھی خوش نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس نقصان کو پورا تو کیا جا سکتا تھا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر شام کو آرام ختم کر کے رات گئے تک سلائی میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ، وہ کپڑے والے کے مقروض بھی تھے اور اس کا قرض دینا بھی ضروری تھا، اس لیے وہ گھر میں اور گھر سے باہر کہتی پھرتی تھی کہ یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ ایک دھوکے باز کو اس سے پہلے کہ وہ اپنا قرض ادا کرے، گرفتار کر کے اسے قرض خواہوں سے پناہ دے دی گئی۔ اس نے یہاں تک کہا کہ وہ اپنے ۳۲ اسکوڈی کی خاطر روم میں مقدس باپ کے پاس تک جانے سے دریغ نہیں کرے گی، اور پھر وہ آخر میں یہ بھی کبھی کبھی کہتی تھی کہ ''اور اسے آگ کے ایندھن پر اوورکوٹ کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔''

اس سلسلے میں وہ اپنے محلے کے پادری کے پاس بھی گئی اور جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا تھا وہ بیان کیا، اس پر پادری نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مقدس عدالت سے یہ مطالبہ کرے کہ اگر اسے پیسے نہیں دیے جا سکتے تو کم از کم اوورکوٹ ہی دے دیا جائے۔ لیکن بوڑھی عورت کا کہنا تھا کہ اوورکوٹ برونو کے ماپ کے مطابق تیار ہوا ہے، اور وہ کوٹ یقیناً اس نے پہنا بھی ہوگا، اس لیے وہ کوٹ واپس لے کر اس کا کیا کرے گی؟ اسے تو اس کی قیمت چاہیے۔ جب اس نے زیادہ شور وغوغا کیا تو پادری نے اسے کمرے سے نکال دیا۔ اس پر وہ تھوڑا سا ڈری اور کچھ ہفتے خاموش رہی، اور گرفتار ملحد کے خلاف اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔

شہر میں ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ مقدمہ میں عدالت نے بہت ہی ظالمانہ اور غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے، بوڑھی عورت اِدھر اُدھر سے یہ سب باتیں غور سے سنتی رہتی، اس کے لیے یہ بات اذیت کا باعث تھی کہ ملحد کے خلاف سنگین الزامات لگائے گئے ہیں، اس لیے اس کے آزاد ہونے کے امکانات نہیں، اور جب وہ آزاد نہیں ہوگا تو اپنا قرض بھی ادا نہیں کر سکے گا۔ اس خیال سے اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔

اگست کے مہینے میں جب گرمی نے سب کے ہوش اڑا رکھے تھے، تو اس نے اپنے گاہکوں کے سامنے شکایتوں کی بھرمار شروع کر دی، اور یہاں تک کہا کہ پادریوں کو سخت گناہ ہوگا، اگر انھوں نے ایک غریب دستکار کے جائز مطالبے کو پورا نہیں کیا اور اسے ایسے ہی رہنے دیا، کیوں کہ ایک تو ٹیکسوں کی بھرمار ہے اور پھر مہنگائی؛ اور اس صورت حال میں مالی نقصان۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن صبح کے وقت ایک عہدیدار اسے مقدس دفتر لے گیا اور وہاں اسے تنبیہ کی گئی کہ وہ آئندہ کے لیے اپنی زبان پر قابو رکھے۔ اس سے کہا گیا کہ کیا اسے شرم نہیں آتی کہ وہ چند سکوں کی خاطر ایک انتہائی مقدس اور اہم مقدمہ میں رکاوٹ ڈال رہی ہے؟ اس سے کہا گیا کہ وہ خود سمجھ جائے، ورنہ اسے خاموش کرنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں گے۔

کچھ عرصہ کے لیے تو اس تنبیہ نے اثر کیا، لیکن جب اسے مقدس عہدیدار کے یہ الفاظ یاد آتے کہ ''چند سکوں کی خاطر''؛ تو اسے غصہ آجاتا، مگر صبر کر کے خاموش ہو جاتی۔ لیکن ستمبر کے مہینے میں جب یہ خبر پھیلی کہ انکوئیزیشن کے بڑے آفس نے قیدی کو روم بلایا ہے تو ایک بار پھر عورت کو اپنے پیسوں کی فکر پڑ گئی۔

کچھ عرصہ کے لیے شہر کے لوگوں میں یہ بات موضوع بحث بن گئی کہ اسے روم کے حوالے کیا جائے یا نہیں؟ شہر کی انتظامیہ روم کی عدالت کی برتری ماننے پر تیار نہیں تھی۔ ادھر بوڑھی عورت کو فکر تھی کہ کیا واقعی اس ملحد کو قرض چکائے بغیر روم جانے دیا جائے گا؟ ابھی اس نے اس خبر کی تصدیق بھی پوری طرح نہ کی تھی، کہ اس سے ضبط نہیں ہوا، اور وہ بھاگی ہوئی مقدس عدالت کی عمارت جا پہنچی۔

اس مرتبہ ایک بڑے عہدیدار نے اس سے ملاقات کی، اور تعجب کی بات یہ تھی کہ پچھلے عہدیداروں کے مقابلے میں اس نے، اس کی بات زیادہ غور سنی، جب وہ اپنی شکایت کر چکی تو بوڑھے عہدیدار نے معمولی وقفہ کے بعد سوال کیا کہ کیا وہ برونو سے ملنا پسند کرے گی؟

اس نے فوراً ہی ہامی بھر لی، اور ملاقات کے لیے دوسرا دن مقرر ہوا۔

دوسرے دن صبح کے وقت، ایک چھوٹے سے کمرے میں جن کی کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں، اس کی ملاقات ایک دبلے پتلے چھوٹے سے آدمی سے ہوئی جس کی کالی داڑھی تھی۔ اس نے بڑے مہذب انداز میں اس سے پوچھا کہ اس کا کیا مطالبہ ہے؟

اس نے قیدی کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ ماپ دینے آیا تھا، اسی لیے اس کے ذہن میں اس کی شکل محفوظ تھی، لیکن اب وہ اسے فوراً نہیں پہچان سکی، مقدمے کے دوران اس میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔

بوڑھی عورت نے جلدی جلدی کہا، ''وہ اوورکوٹ، جس کی قیمت آپ نے ادا نہیں کی۔''

برونو نے چند لمحہ اسے تعجب سے دیکھا، اور تھوڑی دیر بعد، جب اسے کچھ یاد آیا تو اس نے آہستگی سے پوچھا، ''میں آپ کا کتنے کا قرض دار ہوں؟''

''۱۳۲ اسکوڈی کے''، اس نے کہا ''اس کا بل آپ کو دے دیا جائے گا۔''

اس پر برونو نے اس موٹے عہدیدار کی طرف دیکھا جو اس گفتگو کے دوران اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا، اس سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ اس کی کتنی رقم مقدس آفس میں جمع کی گئی ہے۔ موٹے عہدیدار کو اس کا علم نہ تھا مگر اس نے وعدہ کیا کہ وہ اسے معلوم کر کے بتائے گا۔

قیدی دوبارہ اس بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہوا، اور یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا اصل مسئلہ تو ختم ہوا، اس سے پوچھا کہ ''آپ کے شوہر کے مزاج کیسے ہیں؟''

بوڑھی عورت جو قیدی کے اخلاق سے پریشانی ہو چکی تھی، بڑبڑائی کہ اس کا شوہر ٹھیک ہے، صرف یہ کہ تھوڑا بہت اس کے جوڑوں میں درد رہتا ہے۔

دو دن بعد وہ پھر مقدس عدالت کے آفس گئی اور برونو سے ملنے کی خواہش کی۔

اس کو ایک بار پھر ملنے اور بات کرنے کی اجازت مل گئی، لیکن اس بار اسے چھوٹے سلاخوں لگی کھڑکیوں والے کمرے میں قیدی کا کوئی ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا، کیوں کہ وہ عدالت میں تھا، جب وہ واپس کمرے میں آیا، تو چہرے بڑا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ کمرے میں چونکہ کوئی کرسی نہیں تھی، اس لیے وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی بوڑھی عورت سے مخاطب ہو کر بہت ہی کمزور آواز میں اسے بتایا کہ، اس کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اوورکوٹ کی قیمت ادا کر سکے، کیوں اس کا سامان جو مقدس عدالت میں جمع ہے، اس میں نقد رقم کچھ نہیں۔ لیکن اسے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ فرینکفرٹ میں ایک پبلشر نے اس کی کتابیں چھاپی ہیں جس کے پیسے اس نے اسے نہیں دیے ہیں، کل صبح وہ مقدس عدالت سے درخواست کرے گا کہ اسے پبلشر کو خط لکھنے کی اجازت دے۔ آج اسے دوبارہ مقدمہ میں پیش ہونا ہے۔ اگر چہ وہ تھک چکا ہے اور اس کی طاقت جواب دے چکی ہے مگر اسے اپنا دفاع کرنا ہے، اسے ڈر ہے کہ وہ سوالوں کا جواب شاید ٹھیک سے نہیں دے سکے۔

جب وہ بول رہا تھا تو بوڑھی عورت چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ ایسے قرض داروں کو خوب جانتی تھی جو پیسے دینے میں لیت و لعل کرتے تھے اور طرح طرح کے بہانے بنایا کرتے تھے۔

''جب تمھارے پاس اوورکوٹ کے پیسے دینے کو نہیں تھے، تو تم نے اوورکوٹ کس لیے سلوایا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

قیدی نے اس کی بات سن کر گردن ہلائی اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کی بات سمجھ گیا ہے۔

اس نے جواب میں کہا، ''میں نے ہمیشہ کتابیں لکھ کر اور لیکچر دے کر پیسہ کمائے ہیں، اس لیے میرا خیال تھا کہ میں جلد ہی کچھ پیسے کما لوں گا، اوورکوٹ مجھے اس لیے چاہیے تھا کہ میرا ارادہ چھٹیوں میں باہر جانے کا تھا۔'' یہ اس نے بغیر کسی تلخی کے ساتھ کہا۔ بوڑھی عورت کو اس جواب سے آگ لگ گئی، اور وہ غصہ سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے پیسے تو اب ڈوب گئے۔

اس رات کو سوتے وقت اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ ''وہ کون بے وقوف ہوگا جو ایسے شخص پیسے بھیجے گا، جس پر انکوئیزیشن میں مقدمہ چل رہا ہو۔''

اس کا شوہر تو اس بات پر ہی خوش تھا کہ اسے روحانی عہدیداروں نے سستا چھوڑ دیا، اور وہ اس پر پریشان تھا کہ اس کی بیوی پیسوں کی وصولیابی کے لیے ناحق کوشش کر رہی ہے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ ''اب اسے دوسری باتوں کے متعلق سوچنا چاہیے۔''

دوسرا مہینہ بھی ان کے ناخوشگوار مسائل میں کوئی تبدیلی لائے بغیر گذر گیا۔ جب جنوری کا مہینہ شروع ہوا تو پوپ نے جمہوریہ پر دباؤ ڈالا کہ ملحد کو مقدمہ کی کاروائی کے لیے روم بھیجا جائے۔ اسی موقعہ پر اس

بوڑھی عورت کو بھی مقدس آفس میں آنے کا دعوت نامہ ملا، چونکہ دعوت نامہ میں کسی خاص وقت کی پابندی کا ذکر نہیں تھا، اس لیے وہ ایک دو پہر وہاں چلی گئی۔ اس وقت قیدی جمہوریہ کے سرکاری وکیل کا انتظار کر رہا تھا، جو کہ شہری کونسل کی جانب سے اس کے روم جانے کے خلاف اپیل کرنا چاہتا تھا۔

بوڑھی عورت کا استقبال اسی عہدیدار نے کیا جس نے پہلی بار اس کی ملاقات کا برونو سے انتظام کرایا تھا۔ عہدیدار نے اسے بتایا کہ قیدی کی اس سے ملنے کی خواہش ہے لیکن اس وقت وہ اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں ایک اہم گفتگو میں مصروف ہے، لہٰذا پہلے اس سے معلوم کر لیا جائے کہ وہ تم سے ملنے پر تیار ہے یا نہیں۔

عورت نے بھی مختصراً جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہاں ہاں ضرور معلوم کر لیا جائے۔

اس پر ایک آدمی فوراً باہر گیا، اور جب وہ واپس آیا تو قیدی اس کے ہمراہ تھا، دونوں کی گفتگو اس اعلیٰ عہدیدار کے درمیان ہوئی۔

اس سے پہلے کہ برونو، جو دروازے سے مسکراتا ہوا آیا تھا؛ کچھ کہتا، بوڑھی عورت فوراً بولی اگر آپ کا ارادہ چھٹیوں میں کہیں جانے کا تھا، تو پھر آپ نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ چھوٹا آدمی تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہو گیا، اس نے ان تین مہینوں میں اتنے سوالات کے جواب دیے تھے کہ وہ فوراً کچھ نہ کہہ سکا، اور اسے عورت کے ساتھ آخری ملاقات بھی زیادہ یاد نہ رہی تھی، اس نے اس سے مخاطب ہو کر کہا؛ ''مجھے کوئی رقم نہیں مل سکی۔ میں نے اس سلسلہ میں دو بار لکھا، مگر کوئی جواب نہیں آیا، اس لیے میں نے سوچا ہے کہ آپ اوورکوٹ واپس لے لیں۔''

''مجھے معلوم تھا کہ یہی ہونے والا ہے''، بوڑھی عورت نے حقارت سے کہا، ''اسے ہم نے آپ کے ماپ کا بنایا تھا، اور وہ دوسروں کے کس کام آئے گا۔''

برونو نے اندرونی اذیت محسوس کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا، ''میں نے یہ سوچا تک نہیں تھا۔'' وہ مقدس عہدیدار کی جانب مڑا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا، ''کیا میں اپنی تمام چیزیں فروخت کر کے اس کی رقم انھیں دے سکتا ہوں؟''

''یہ ممکن نہیں'' اس عہدیدار نے کہا جو اسے بلا کر لایا تھا، ''اس پر تو جناب موچے نیگو کا دعویٰ ہے، کیوں کہ آپ ایک عرصہ تک ان کے خرچہ پر ان کے ہاں رہے تھے۔''

''اس نے مجھے دعوت دے کر بلایا تھا'' برونو نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، اس پر بوڑھے عہدیدار نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کو کہا، اور بولا ''اس وقت اوورکوٹ یہاں نہیں ہے، اور میرا خیال ہے کہ اب اسے یہاں لایا جائیگا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اب معاملہ پھر نئے سرے سے شروع ہوگا؟'' عورت غصے سے بولی۔

بوڑھے عہدیدار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، اور اس نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے کہا، ''محترمہ! اگر آپ میں تھوڑی سی عیسائیت کی روح موجود ہو تو اس بات کو سمجھیں کہ یہ ملزم اس وقت ایک ایسے مقدمہ میں ملوث ہے جس میں اس کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس لیے آپ اس پر اصرار نہیں کر سکتیں کہ وہ صرف

آپ کے اوورکوٹ میں دلچسپی لے۔''

عورت نے اسے غصہ دار جھنجھلاہٹ کے ساتھ دیکھا، مگر پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ وہ کس جگہ ہے، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جانا چاہتی تھی کہ اس وقت قیدی نے آہستگی سے کہا کہ ''میرا خیال ہے کہ وہ یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔''

جب عورت اس کی طرف مڑی تو اس نے کہا، ''مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ آپ یہ مت سوچیے کہ آپ کو نقصان برداشت کرنے دوں گا۔ میں اس سلسلہ عوامی عدالت سے اپیل کروں گا۔''

اس عرصہ میں وہ موٹا عہدیدار جو باہر چلا گیا تھا، واپس آیا اور کہنے لگا۔

''اوورکوٹ کسی بھی صورت میں واپس نہیں کیا جائے گا۔ جناب موچے نیگو اسے ہر حالت میں لینا چاہتے ہیں۔''

یہ سن کر برونو کو سکتہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ قطعی لہجہ میں بولا ''یہ ٹھیک نہیں ہے، میں اس پر مقدمہ کروں گا۔''

بوڑھے عہدیدار نے اس پر اپنا سر ہلایا اور برونو سے مخاطب ہو کر بولا ''آپ اپنی اس اپیل کو تیار کریں، جو آپ سرکاری وکیل سے مل کر کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہاں زیادہ عرصہ کے لیے روکنا نہیں چاہتا کہ آپ چند اسکوڈی کی خاطر ان جھمیلوں میں پڑیں۔''

یہ سن کر بوڑھی عورت کو سخت غصہ آ گیا، اور اس کے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

''چند اسکوڈی''، اس نے چیخ کر کہا، ''یہ ایک مہینے کی کمائی ہے، یہ آپ کے لیے شاید نقصان نہ ہو اور آپ اسے برداشت کر لیں، مگر ہمارے لیے ایسا نہیں۔''

اسی لمحہ ایک راہب کمرے میں آیا اور زور سے بولا؛ ''سرکاری وکیل آ گیا ہے۔''

موٹے عہدیدار نے برونو کو بازو سے پکڑا اور اسے باہر لے گیا، اس نے جاتے جاتے آخر وقت تک بوڑھی عورت کو دیکھا، اس کا دبلا پتلا چہرہ بالکل پیلا ہو گیا تھا۔ بوڑھی عورت پریشانی کے عالم میں عمارت کی پتھر والی سیڑھیوں سے اتر کر باہر آئی۔ وہ اس حد تک پریشان تھی کہ اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ رکھا تھا۔ کچھ دن تک وہ اپنی دکان پر بھی نہیں گئی۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ بعد وہ موٹا عہدے دار اوورکوٹ لے کر اس کے پاس آیا اور کہنے لگا؛

''آخری دنوں تک وہ صرف اوورکوٹ کی خاطر لڑتا رہا، دو بار اس نے عدالت سے اپیل کی۔ اس وقت بھی جب کہ اس کے مقدمہ کی کاروائی جاری تھی، وہ عدالت کے اعلیٰ عہدیداروں سے مقدمہ کی بجائے اوورکوٹ کے مسئلہ پر بات کرتا رہا، یہاں تک کہ آخر کار وہ کامیاب ہو گیا اور موچے نیگو کو اوورکوٹ واپس کرنا پڑا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس وقت اسے اس اوورکوٹ کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی، کیوں کہ اسی ہفتہ اسے روم لے جایا جا رہا ہے۔''

اور یہ سچ بھی تھا، کیوں کہ یہ جنوری کے آخری دن تھے۔

ساتواں سبق

زیف سید

''بڑے میاں! تمھیں کس جرم میں دھر لیا سالوں نے؟'' ڈیوک نے پوچھا۔

انصاری یہ سوال سن کر چونک گئے۔ حوالات کی نیم تاریک فضا میں سیمنٹ کی بینچ پر دیوار سے سر ٹیکے ہوئے خاموش ہیولے اور دور کہیں سے آنے والی ٹریفک کی مدھم گھن گھن انھیں غیر حقیقی معلوم ہو رہی تھی، جیسے وہ خود اس منظر کا حصہ نہ ہوں بلکہ باہر سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔ عمارت کے اندر دور کہیں سے بھاری قدموں کی آواز گونج رہی تھی۔

''لگتا ہے پہلی بار اس طرف آنا ہوا ہے جناب کا؟'' ڈیوک نے ان کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا؛ ''پریشان نہ ہو بڑے میاں! شروع شروع میں سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن دو چار روز میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، پھر لگے گا کہ جیسے یہیں پیدا ہوئے تھے۔'' ڈیوک نے کہا اور اس کی ہنسی حوالات کی نیم تاریک فضا میں پھیل گئی، تاہم اس میں تمسخر سے زیادہ خوش دلی کا پہلو نمایاں تھا۔

انصاری کو خود ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ انھیں کس جرم میں پکڑا گیا ہے۔ انھوں نے ہوں ہاں کر کے اپنے ساتھی حوالاتی کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو تمھاری مرضی۔ ویسے بھی جیل حوالات کا ان لکھا قانون یہ ہے کہ کسی سے اس کے جرم کے بارے میں نہ پوچھا جائے۔ ہاں، کوئی خود اپنی مرضی سے بتا دے تو الگ بات ہے۔ وقت کٹ جاتا ہے اور دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔''

انصاری ایک غیر مرئی نوالا سا نگل کر رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈیوک کو کیسے بتائیں کہ انھیں کس جرم میں اندر کیا گیا ہے۔ حوالات کے ماحول نے انھیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈیوک کی باتوں میں انھیں تھوڑی اپنائیت محسوس ہوئی تھی، اور کئی گھنٹوں کے بعد انھیں اپنے وجود میں زندگی کے آثار دکھائی دینا شروع ہوئے تھے ورنہ جب وہ یہاں پہنچے تھے تو اس وقت ان کا ذہن بالکل سُن تھا، جیسے انسان کسی اجنبی بستر پر آنکھیں کھولتا ہے تو اسے کچھ لمحہ اس بات کا تعین کرنے میں لگ جاتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن ان کے

ساتھ یہ سب کچھ جاگتے میں ہو رہا تھا۔

انصاری نے گردن گھما کر حوالات کے کمرے کا جائزہ لیا۔ گرفتاری کے بعد پولس والا انھیں لے کر اس عمارت میں لایا تھا اور پولس کی سیاہ وردی میں ملبوس سفید بالوں والے ایک شخص کے حوالے کر کے خود باہر چلا گیا تھا۔ اس شخص نے انصاری کی جیبوں سے سارا سامان اور جوتوں سے تسمے نکال لیے، موبائل فون، بٹوا، گاڑی کی چابیاں۔ ایک فارم پر ان سے دستخط لینے کے بعد وہ انھیں ایک اور کمرے میں لے گیا اور ایک آہنی بینچ سے ہتھ کڑیاں زنجیروں کے ساتھ منسلک تھیں لیکن اس نے انصاری کو وہ ہتھ کڑیاں پہنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کمرے کے بیچوں بیچ ایک میز پر ایک ٹیوب اور ایک چھوٹا سا رولر پڑا ہوا تھا۔ اس پولس والے نے ٹیوب دبا کر اس میں سے سیاہ رنگ کی کریم نکالی اور اسے ایک آہنی تختے پر لگا دیا اور پھر رولر سے دبا کر اسے سارے تختے پر یکساں ہموار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے قریب ہی ایک شکنجہ نما چیز میں کاغذ پھنسائے اور پھر انصاری کو قریب بلا کر ان کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ انگوٹھا پکڑ کر اس نے پہلے سیاہی ملے ہوئے تختے پر دبایا، پھر اسے کاغذ پر خوب زور سے دبایا۔ اب جا کر انصاری پر کھلا کہ وہ ان کی انگلیوں کے نشان لے رہا ہے۔ پہلی دو کوشش ناکام ہو گئیں، کیوں کہ عین وقت پر انصاری کا ہاتھ ہل جاتا تھا یا ہاتھ اکڑ جاتے تھے۔ آخر اہلکار نے سخت لہجے سے ان سے کہا کہ اپنے ہاتھ کو بالکل بے جان کر کے مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیں، تب جا کر کہیں چوتھی کوشش پر کامیابی نصیب ہوئی تو انصاری نے سکھ کا سانس لیا۔ دسوں انگلیوں کے نشانات لینے کے بعد اس نے انصاری کو قریبی دیوار سے لگے سِنک سے ہاتھ دھونے کی ہدایت کی۔ ساتھ میں مائع صابن کا ڈبا بھی لگا تھا۔ انصاری نے رگڑ رگڑ کر ہاتھوں سے سیاہی دھونے کی کوشش کی۔ اتنی دیر میں پولس والا کیمرہ لے کر آ گیا اور انھیں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے سامنے اور سائیڈ سے انصاری کی تصاویر لیں۔ ان کاموں سے فراغت کے بعد اس نے انصاری کو ایک اور شخص کے حوالے کیا جو انھیں اپنے ساتھ لے کر کسی ہسپتال کی طرح صاف ستھری راہداریوں سے گذارنے کے بعد اس نیم تاریک ہال میں لایا اور سلاخوں والا بھاری دروازہ بند کر کے باہر چلا گیا۔ انصاری کے انگوٹھوں پر اور ناخنوں کے نیچے سیاہی کے دھبے تھے اور آنکھیں ابھی تک فلیش کی چکاچوند سے چندھیائی ہوئی تھیں۔ وہ خاصی دیر تک کمرے میں کھڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کی آنکھیں نیم تاریکی کی عادی ہو گئیں، تب انھیں کمرے میں تین دیواروں کے ساتھ ساتھ لمبائی میں بنی ہوئی سیمنٹ کی لمبی بینچ نظر آئی جو دیواروں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم گھسیٹتے ہوئے ایک دیوار کی طرف گئے اور بینچ پر ٹک کر اپنا سر بازوؤں پر رکھ دیا۔

ہاشم علی انصاری کا پولس سے کچھ زیادہ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ پاکستان میں تو ان کا کبھی ٹریفک چالان تک نہیں ہوا تھا، جس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے وہاں کبھی گاڑی چلائی ہی نہیں تھی۔ کراچی میں ان کے پاس اسکوٹر ہوا کرتا تھا۔ ان کا مزاج شروع ہی سے ایڈونچر پسند رہا تھا۔ کبھی کبھار دل میں ترنگ جاگتی تھی تو

ادھیڑ عمر میں بھی کراچی کی سڑکوں پر نہایت تیز رفتاری سے اسکوٹر چلایا کرتے تھے۔ گھومنے پھرنے کا شوق حد سے زیادہ تھا۔ اسی اسکوٹر پر بیگم کو جگہ جگہ لیے لیے پھرتے تھے۔ کلفٹن، پیراڈائز پوائنٹ، ہاکس بے، گارڈن، چڑیا گھر تو خیر آس پاس تھے، کئی بار وہ اسی اسکوٹر پر مکلی، منچھر جھیل اور حیدر آباد بھی چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ تو سکھر بھی ہو آئے تھے۔ وطن میں تین چار دفعہ ٹریفک سارجنٹ نے اگر روکا بھی تو وہیں دس پانچ روپے لے کر جانے دیا۔ البتہ امریکہ میں پولس نے انھیں دو بار جرمانہ کیا تھا۔ ایک بار وہ ''اسٹاپ'' کے نشان پر رکے بنا آگے بڑھ گئے تھے۔ دوسری دفعہ تو ایسا ہوا کہ ڈاک میں ان کی گاڑی کی تصویر اور سو ڈالر ہرجانے کا نوشتہ آ گیا کہ آپ نے سرخ بتی کی خلاف ورزی کی ہے۔ انصاری نے پولس اسٹیشن جا کر بحث کرنے کی کوشش کی کہ جس وقت وہ چوک سے گذر رہے تھے، اس وقت بتی سرخ نہیں تھی، لیکن خاتون پولس افسر نے انھیں کمپیوٹر اسکرین پر ویڈیو دکھا دی جس میں صاف نظر آ رہا تھا کہ انصاری اگرچہ نارنجی بتی پر چوک پار کر رہے تھے لیکن چوک کے وسط تک پہنچتے پہنچتے بتی سرخ ہو گئی تھی۔ ثبوت ناقابل تردید تھی، اس لیے انصاری کو نہ صرف جرمانے کی پوری رقم دینا پڑی بلکہ بیس ڈالر اوپر سے بھی بھرنا پڑے کہ یہ پولس کے فیصلے کو غلط طور پر چیلنج کرنے کی فیس تھی۔

انصاری کی ڈیوک سے ملاقات اسی حوالات میں ہوئی تھی۔ گذشتہ کئی گھنٹوں میں ان کا واسطہ جتنے لوگوں سے پڑا تھا، ان میں وہ سب سے مہربان تھا۔ یہ نہیں کہ پولس والوں نے ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہو، لیکن ان کا انداز بے حد خشک اور سرد تھا، اور دوسری طرف خود انصاری بھی صدمے کی حالت میں تھے، اس لیے وہ مشینی انداز میں ان کے سارے احکامات پر بے چوں و چرا عمل کرتے چلے آئے تھے۔ حوالات میں نہ جانے کتنی دیر گذری کہ ان کے کانوں میں کسی اجنبی زبان میں گفتگو کی آواز آئی۔ انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چھت پر ایک کم طاقت والا بلب جل رہا تھا، جس کی روشنی میں معلوم ہوا کہ وہ یہاں اکیلے نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ یہاں کئی ہیولے موجود ہیں۔ ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ٹیلی فون لگا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے آگے کھڑا ہسپانوی زبان میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید جھلاہٹ کے عالم میں ہے۔ انصاری کو ہسپانوی نہیں آتی تھی لیکن پچھلے دو عشروں کے دوران امریکہ میں میکسکو سے آئے ہوئے تارکین وطن کی تعداد میں بے تحاشا اضافے کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے ہسپانوی امریکہ کی دوسری بڑی زبان بن گئی تھی۔ انصاری کے گھر میں صفائی کرنے والی عورت بھی ہسپانوی تھی، جسے انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا تھا۔ اس سے بات چیت کرنے کے لیے ان کی بیگم ریحانہ کو ہسپانوی کے چند جملے سیکھنا پڑے تھے۔

حوالات کی سرد بینچ پر بیٹھے بیٹھے انصاری کی تشویش بڑھنے لگی۔ یہاں مختلف عمر و نسل کے لوگ موجود تھے، جن میں کچھ اونگھ رہے تھے۔ ایک کونے سے تو باقاعدہ خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کئی کالے بیٹھے تھے جن کو ایک زمانے میں ''نیگرو'' کہا جاتا تھا مگر اب نسل پرستی کے

خلاف تحریک اور انسانی حقوق کی مہم کے باعث انھیں افریقی امریکی کہا جاتا ہے، کیوں بقول امریکیوں کے، لفظ ''نیگرو'' کے تاریخی پس منظر کے باعث اس سے نسل پرستی کی بو آتی ہے۔

داہنی دیوار کے ساتھ دو ہسپانوی نژاد مرد بیٹھے ہاتھ ہلاتے ہوئے آپس میں اونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ انصاری اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھے۔ انھوں نے سکہ ڈالنے کی جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کہیں وہ درز نظر نہیں آتی جہاں عام پبلک ٹیلی فونوں میں سکہ ڈال کر گفتگو کی جاتی ہے۔ پھر انھیں یاد آیا کہ حوالات میں بند کرنے سے پہلے پولس نے ان کا بٹوا، موبائل فون، گھڑی، حتیٰ کہ پتلون کی بیلٹ تک اتروا کر اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور ان تمام اشیا کا اندراج کمپیوٹر میں کر کے رسید پر ان کے دستخط لے لیے تھے۔ انھوں ریسیور اٹھایا تو اس میں سے نمبر ڈائل کرنے کی ہدایات سنائی دیں لیکن انصاری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ فون کیسے استعمال کیا جائے۔ ہدایات میں کوئی نمبر مانگا جا رہا تھا۔ انھوں نے بے بسی کے عالم میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ فام نوجوان اٹھا اور ٹیلی فون کے پاس جا کر نمبر ملانے لگا۔ انصاری نے غور سے اس کی حرکات و سکنات دیکھے کہ شاید کچھ اشارہ مل جائے اور انھیں فون کرنے کے لیے کچھ مدد مل سکے۔ نوجوان جلدی جلدی ڈائل پر چند نمبر دبائے اور تھوڑی ہی دیر میں گفتگو شروع کر دی۔ انصاری اٹھ کر کھڑے ہو گئے کہ وہ اپنی بات مکمل کر لے تو وہ اس سے مدد کی درخواست کر دیں۔ نوجوان چند منٹ تک بات کرتا رہا، پھر جب اس نے ''بائے'' کہہ کر ریسیور رکھا تو انصاری تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کی قریب پہنچ گئے۔ نوجوان نے بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھا جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ نوجوان نے ایک بنیان پہن رکھی تھی جو کسی زمانے میں سفید رہی ہوگی۔ اس نے سر کے بالوں کو چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں گوندھا ہوا تھا جو برگد کی جٹا دھاری جڑوں کی طرح اس کے چہرے کے دائیں بائیں لٹک رہی تھیں۔ انصاری نے نہایت لجاجت سے فون کرنے کا طریقہ پوچھا تو نوجوان یوں بے پروائی سے کندھے اچکا کر دیوار کے پاس جا کر بیٹھ گیا، جیسے اسے انگریزی میں نہیں بلکہ چینی زبان میں مخاطب کیا گیا ہو۔ انصاری اپنی جگہ پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

وہ دیر تک فون کے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے رہے۔ اتنی دیر میں ایک سیاہ فام شخص اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ اس کی عمر پچاس پچپن کے قریب ہوگی۔ جسم بھاری بھرکم اور قد لمبا تھا۔ اس کے ماتھے پر یکساں فاصلے پر بنی ہوئی گہری شکنیں تھیں جیسے کسی نے بڑی احتیاط سے بنائی ہوں۔ اس نے گہری سرخ ٹی شرٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی میلی جینز پہن رکھی تھی جس کے پائنچے ادھڑے ہوئے تھے۔ تاہم جب اس نے سیاہ فام امریکیوں کے مخصوص بے تکلف لہجے میں بات شروع کی تو آواز خاصی کھردری ہونے کے باوجود انصاری کو خوشگوار لگی۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''ہائے! میرا نام ڈیوک ہے۔ کیا کسی کو فون کرنا ہے؟''

''ہاں، بہت شکریہ۔ فون کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ فون کرنے والے کوئی نمبر مانگ

رہے ہیں۔ میرے پاس تو یہ نمبر نہیں ہے۔''

''اپنی کلائی دکھاؤ، اس پر تمھارا نمبر درج ہے۔ لاؤ میں نمبر ملاتا ہوں۔''

انصاری کو یاد آیا کہ تصویر لینے کے بعد ایک اہلکار نے ان کی کلائی پر نیلے ربڑ کا رسٹ بینڈ پہنا دیا تھا۔ انھوں نے اپنی کلائی ڈیوک کے سامنے کر دی۔

''جی بڑے میاں! ٹیلی فون نمبر کیا ہے جس پر بات کرنی ہے؟''

انصاری اس سوال پر تھوڑا اگڑ بڑا گئے۔ کس سے بات کرنی ہے؟ بیگم سے، اور کس سے۔ لیکن آج جو کچھ میرے ساتھ ہوا، اس کے بعد کس منھ سے اس سے بات کروں؟

چوتھائی صدی قبل جب انصاری خاندان کا امریکی ویزا منظور ہوا، اس وقت ان کا بیٹا سرمد چھ سال کا تھا۔ ریحانہ کے بڑے بھائی بہت زمانے سے کیلی فورنیا میں مقیم تھے، انھوں نے شہریت ملتے ہی اپنی بہن اور اس کی فیملی کے لیے اسپانسر شپ کی درخواست دی تھی جو کئی برس کے بعد اس وقت منظور ہوئی جب ریحانہ اور انصاری دونوں اسے قریب قریب بھلا بیٹھے تھے۔ اس وقت انصاری کراچی بلدیہ میں ملازمت کے چوبیس سال پورے کر چکے تھے۔ انھوں نے فوراً ہی قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی۔ ہمیشہ ہی سے سنسنی خیزی کے متلاشی انصاری بھلا یہ نادر موقع ہاتھ سے کہاں جانے دیتے۔ ریحانہ نہیں آنا چاہتی تھیں۔ انھیں اپنے ماں باپ، رشتے داروں، عزیزوں، سہیلیوں سے بچھڑ کر ایک اجنبی ملک میں آباد ہونے کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی لیکن انصاری نے یہی کہا، ''بس چار پانچ سال ہی کی تو بات ہے، تھوڑی سی سیر و تفریح ہو جائے گی، کچھ پس انداز کر لیں گے، واپس آ کر اپنا مکان خرید لیں گے اور ایک چھوٹی سی گاڑی۔ یہاں کے حالات تو تمھارے سامنے ہیں، مہینے کے شروع میں جو ملتا ہے، وہ بیس تاریخ آتے آتے ہوا ہو جاتا ہے۔ اور پھر سرمد کی ابتدائی تعلیم وہاں سے ہو گی تو اسے مستقبل میں بڑا فائدہ ہوگا۔'' یہ آخری دلیل ایسی تھی جس کے آگے ریحانہ کو ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ چنانچہ گھر کا سامان اونے پونے بیچ کر یا ہمسایوں اور رشتے داروں میں بانٹ کر تین نفوس پر مشتمل خاندان امریکی ریاست ورجینیا میں آن بسا۔

''جی بڑے میاں! کیا نمبر بھول گئے؟'' ڈیوک نے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں، نہیں، یاد ہے۔'' انصاری نے بوکھلا کر اور تیزی سے اپنے گھر کا نمبر بتایا۔

''تم چاہو تو اس نمبر پر کلکٹ کال کر سکتے ہو یعنی اس کا بل دوسری پارٹی کو جائے گا لیکن بات سے پہلے ان کی رضا مندی ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے، کلکٹ کال ہی کر لو۔'' انصاری نے بے دھیانی میں کہا۔

''کوئی فون نہیں اٹھا رہا ہے،'' ڈیوک نے نمبر ملانے کے بعد کہا، ''چلو دوبارہ کوشش کرتے ہیں۔''

لیکن دوسری بار بھی گھنٹی بجتی رہی اور آخر آنسرنگ مشین آن ہو گئی۔ کالے نے ریسیور انصاری کو تھما

دیا۔ دوسری طرف خود انصاری بول رہے تھے، ''فون کرنے کا بہت شکریہ۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں، لیکن اگر آپ اپنا نام اور نمبر ریکارڈ کرا دیں تو ہم آپ کو پہلی فرصت میں فون کرنے کی کوشش کریں گے، شکریہ۔'' انصاری کو اپنی ہی آواز اتنی اجنبی اور نامانوس لگی کہ پیغام ریکارڈ کرانے کی ''ٹون'' سننے کے بعد الفاظ ان کے گلے میں اٹک گئے اور کوشش کے بعد بھی منھ سے کچھ نہ نکلا۔ انھوں نے ریسیور رکھ دیا۔ نمبر نہ ملنے پر مایوسی تو تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ ذہن کے کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوا اطمینان بھی تھا کہ اچھا ہے کال نہیں ملی، ورنہ وہ بیگم سے کس طرح اور کیا بات کرتے۔

امریکہ مواقع کی سرزمین سہی، لیکن عملی طور پر یہاں رہنا بہت دشوار ثابت ہوا۔ سب سے بڑا مسئلہ نوکری کا تھا۔ انصاری جہاں درخواست جمع کرواتے تھے، جواب ملتا تھا کہ امریکی تجربہ چاہیے۔ ان کی ڈگریاں، طویل تجربہ اور ملازمت کا اعلیٰ ریکارڈ یہاں پر صفر ہو کر رہ گئے تھے۔ پاکستان سے لائی ہوئی رقم ڈالروں میں منتقل ہو کر ویسے بھی سکڑ گئی تھی، اب وہ تیز دھوپ میں پڑے برف کے ڈھیلے کی طرح پگھلنے لگی۔ ریحانہ کے بھائی سے مدد مانگنے کا سوال نہیں تھا۔ آخر انصاری کو مجبوری کی حالت میں ایک اسٹور میں تین ڈالر فی گھنٹہ کی نوکری کرنی پڑی۔ کہاں پاکستان میں سرکاری نوکری کے ٹھاٹ باٹ، چپراسی، خاکروب اور کلرک، جونیئر اسٹاف سے ملنے والی تعظیم و تکریم اور کہاں یہ عالم کہ انصاری سارا دن کاؤنٹر پر کھڑے گاہکوں کو بھگتاتے رہتے تھے۔ اوپر سے سپروائزر مسلسل ان پر یوں نگاہ رکھتے تھے کہ انھیں سر اٹھانے تک کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اگر گاہک نہیں ہیں تو کاؤنٹر کی صفائی، شیلفوں پر سامان کی ترتیب یا اسی طرح کے دوسرے کام ان کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ پورے اسٹور میں کوئی کرسی، صوفہ یا تپائی قسم کی چیز نہیں تھی۔ شروع کے ہفتے میں تو ایسا لگتا تھا جیسے ان کے گھٹنے کسی بھی وقت جواب دے جائیں گے اور وہ ریت کے بت کی طرح زمین پر ڈھیر ہو جائیں گے۔ پھر کسی نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ چمڑے کے جوتوں کی بجائے نرم اور لچکیلے تلوؤں والے جوگرز پہنیں۔ کچھ تو جوگرز کی وجہ سے اور پھر شاید کسی حد تک عادت بن جانے کے باعث تین چار ہفتوں بعد انصاری کو کسی قدر آسانی ہو گئی تھی۔ البتہ وہ اب بھی آنکھ بچا کر کسی ستون یا شیلف کے ساتھ کندھا ٹیک کر دو تین منٹ سستا لیتے تھے۔ گھر واپس آ کر وہ صوفے پر ڈھیر ہو جاتے تھے، اور اس دوران سرمد کی چھوٹی موٹی شرارتیں بھی ان کے اعصاب پر گراں گزرتی تھیں۔

اسٹور میں کام کرتے ہوئے انصاری پر انکشاف ہوا کہ امریکہ میں محض کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہو کر لوگوں سے رقم وصول کرنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا انھوں نے سمجھ رکھا تھا۔ کچھ گاہک ان کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے پیش آتے تھے۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ اسٹور سے ڈبل روٹی، دودھ، سبزی وغیرہ لے جاتے تھے اور استعمال کر کے اگلے دن واپس کرنے آ جاتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ لوگ آدھی پی ہوئی دودھ کی بوتل یا ادھ کھائے پھل اگلے دن واپس لے آئے کہ وہ ان کے معیار سے مطمئن نہیں ہیں اور انھیں پوری رقم واپس کی جائے۔ اسٹور کے منیجر نے انصاری کو ہدایت کر رکھی تھی کہ گاہک کے ساتھ کوئی بحث نہیں کرنی، اس لیے ایسے

موقعوں پر انصاری تلملا کر رہ جانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود ایک بار ایک گاہک نے شکایت کر کے انھیں اسٹور سے نکلوا دیا۔ تاہم خوش قسمتی سے انھیں جلد ہی ایک اور بڑے اسٹور میں نوکری مل گئی۔ اب ان کے پاس امریکی تجربہ آ گیا تھا۔

''تو کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تمھیں کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟'' انصاری نے پوچھا۔ انھیں ڈیوک کی قربت سے کسی قدر تسلی ہو رہی تھی اور وہ اس سے گفتگو کا اسلسلہ جاری رکھنا چاہتے تھے۔

''ارے بڑے میاں! یہ تو اپنا دوسرا گھر ہے بلکہ دوسرا کیا، پہلا ہی سمجھو۔ کیوں کہ باہر تو اپنا کوئی مستقل ٹھکانا تو ہے نہیں۔ بس جب گھومنے گھامنے سے دل اکتا جاتا ہے تو یہاں چلے آتے ہیں۔ ویسے اس بار شاید مجھے لمبے عرصے تک اندر رکھنے کی کوشش کریں۔''

یکا یک حوالات میں ہلچل پیدا ہوگئی اور کچھ لوگوں نے بلند آواز سے بولنا شروع کر دیا۔ انصاری نے دیکھا کہ سامنے کی دیوار پر خاصی بلندی پر ایک ٹیلی ویژن نصب ہے جس کی آواز بند ہے لیکن شاید کوئی خبروں کا چینل لگا ہوا ہے۔ اس پر امریکی صدارتی امیدوار براک اوباما کی تصویر نظر آ رہی تھی جو ڈائس کے پیچھے کھڑے خاصے بڑے مجمعے سے خطاب کر رہے تھے۔ اسٹیج کے پیچھے اوباما کی صدارتی مہم کا نیلا اور سرخ نشان (logo) آویزاں تھا، جس میں ایک شاہراہ کے اوپر چڑھتے ہوئے سورج کا تاثر دیا گیا تھا۔

ڈیوک بھی ٹیلی ویژن اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا، ''بس تم ذرا اوباما کو آنے دو، وہ گن گن کر سب کے بدلے لے گا۔''

انصاری کو یاد آیا کہ ان دنوں امریکہ میں صدارتی انتخابات ہو رہے تھے۔ وہ بڑے شوق سے انتخابی مہم کی تفصیلات دیکھتے چلے آئے تھے۔ انھیں بھی اوباما سے خاصی امیدیں تھیں کہ وہ اقتدار میں آ کر بش کا پھیلایا ہوا گند صاف کر دے گا۔ وہ بڑی شدت سے اس دن کے انتظار میں تھے۔

ریحانہ نے پہلا سال تو گھر ہی میں گذارا، لیکن انصاری کی کم تنخواہ کی وجہ سے ہاتھ اس قدر تنگ رہتا تھا کہ وہ بھی کام تلاش کرنے میں جٹ گئیں۔ انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو کر رکھا تھا اور زمانۂ طالب علمی میں رسالوں میں افسانے اور مضامین لکھتی رہتی تھیں۔ اس لیے ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب انھیں واشنگٹن کے ایک سرکاری ادارے میں امریکی سفارت کاروں اور دوسرے ملازمین کو اردو پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ معقول، میڈیکل انشورنس اور دوسری کئی سہولتیں۔ اب گھر میں سرمد کے لیے نت نئے کھلونے اور پہننے کے لیے عمدہ سے عمدہ لباس آنے لگا۔ اس کے منھ سے جو فرمائش نکلتی تھی، وہ اگلے ہی دن پوری ہو جاتی تھی۔ انصاری کہتے رہتے کہ فضول خرچی ہے، سرمد تو کسی بھی کھلونے دو تین دن کھیلنے کے بعد اس کی طرف آنکھ تک اٹھا کر نہیں دیکھتا، لیکن بیگم نے ان کی بات کی پروا نہیں کی اور گھر کی الماریاں کھلونوں سے بھرتی چلی گئیں۔ کچھ عرصے بعد ریحانہ نے اپارٹمنٹ کی تنگی کی شکایتیں کرنا شروع کر دیں۔ انصاری نے کہا بھی کہ ہمارا کون سا بڑا خاندان ہے اور نہ ہی ہمارے گھر بہت زیادہ مہمان آتے ہیں لیکن

ریحانہ نے خود ہی ایک پاکستانی پراپرٹی ڈیلر سے معاملات طے کر کے فیئر فیکس کے ایک سرسبز شاداب علاقے میں تین کمروں کے گھر کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔

''اچھا تو تم اپنی گرفتاری کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟'' انصاری نے ڈیوک سے پوچھا۔

''ارے بڑے میاں! جرم ورم کیا، سب سے بڑا جرم تو رنگت ہے۔ میں ایک پارٹی میں گیا ہوا تھا، سب نے چڑھا رکھی تھی، میں نے بھی تھوڑی بہت پی لی۔ پھر ہم سب ایک دوست کے ساتھ واپس گاڑی میں جا رہے تھے کہ کسی نے چرس کا سگریٹ سلگا لیا اور سب باری باری کش لینے لگے۔ پھر اچانک پولس نے روک لیا، اور بس۔ دوسرے چھوٹ گئے، ہمیں دھر لیا گیا۔ وجہ یہ کہ پہلے نقب زنی وغیرہ کی چند وارادات میں ہمارا نام تھا، جیل اور پولس ریکارڈ موجود تھا، بس پھر انھیں اور کیا چاہیے تھا۔''

''ارے یہ تو بڑی غلط بات ہے۔''

''اب تو میں یہ بھی بھول گیا ہوں کہ کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے۔ جانتے ہو مجھے سب سے پہلے کس جرم میں اندر کیا گیا؟ بغیر ٹکٹ خریدنے پر ریل میں سفر کرنے پر۔ ادھر ہماری ضمانت دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ ہم بھی حوالات میں پڑے سڑتے رہے اور غلط صحبتوں میں پڑ گئے۔''

''بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔ مجھے کچھ کچھ تو اندازہ تھا لیکن ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ حالات اس حد تک خراب ہیں۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں بڑے میاں۔ دور مت جاؤ، اسی حوالات کو دیکھ لو۔ گنو، تمھیں یہاں بارہ لوگ نظر آئیں گے۔ ان میں سے کالے کتنے ہیں؟ سات۔ ایک تم ایشیائی، آٹھ دس ہسپانوی لگتے ہیں۔ صرف دو گورے یہاں موجود ہیں۔ حالاں کہ آبادی کے تناسب سے یہاں کم از کم آٹھ گورے ہونے چاہئیں تھے۔''

انصاری نے گردن گھما کر ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔ ڈیوک کی بات دل کو لگتی تھی۔ انھیں یاد آیا کہ انھوں نے جہاں جہاں کام کیا تھا، وہاں جونیئر اسٹاف کی بھاری اکثریت سیاہ فام افراد پر مشتمل ہوتی تھی، جب کہ بڑے عہدوں پر کلی طور پر گورے تعینات تھے، حالاں کہ واشنگٹن اور اس کے نواح میں کالوں کی خاصی بڑی آبادی تھی۔

ڈیوک اٹھ کھڑا ہوا اور نسبتاً اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ دوسرے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ڈیوک نے کسی کہنہ مشق مقرر کی طرح باقاعدہ تقریر شروع کر دی۔

''میرے دوستو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، الیکشن میں چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ یہ تاریخ کا ایسا موڑ ہے جو ہزاروں سال بعد بھی یاد رکھا جائے گا۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔ کچھ طاقتیں کبھی بھی نہیں چاہیں گی کہ باہر سے کوئی آ کر صدر بن جائے۔ اس لیے کہ جو کام امریکہ کی ڈھائی سو سالہ تاریخ میں نہیں ہوا، وہ اب کیسے ہو سکتا ہے؟ اس موقعے پر سازش کے تحت مخصوص رنگت کے لوگوں کی پکڑ دھکڑ میں ضرورت سے

زیادہ تیزی دکھائی جا رہی ہے۔ ہمیں چن چن کر اندر کیا جا رہا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے، ہمیں اس موقع پر متحد ہونے کی ضرورت ہے...''

سرمد کی موت کے بعد ریحانہ نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کی صحت اب نوکری کے قابل نہیں تھی۔ پہلے تو ان کے گھٹنوں کا آپریشن ہوا، جس کی وجہ سے وہ کئی ماہ تک بستر سے لگ کر رہ گئیں۔ پھر انھیں شوگر تشخیص ہوگئی اور کچھ عرصے بعد گردوں کا مسئلہ شروع ہوگیا۔ جوں جوں ان کی صحت بگڑتی گئی، ان کے دل میں وطن کی یاد بڑھتی گئی۔ پھر وہ وقت آیا کہ ان کی زبان پر ایک ہی رٹ ہوتی تھی، ''واپس چلو، واپس چلو۔''

انصاری بڑے تحمل سے انھیں سمجھاتے، ''بھئی، کیسے چلے جائیں؟ روز کوئی نہ کوئی معرکہ مارا جاتا ہے۔ جعل سازی، دھوکے بازی، کرپشن، جھوٹ۔ اور اوپر سے جو آج کل کے حالات ہیں، وہ بھی تمھارے سامنے ہیں۔''

انصاری کو ہمیشہ سے اخبار پڑھنے کی عادت تھی اور وہ پاکستان کی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس پر دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے، یا کبھی کسی پاکستانی سے ملاقات ہوتی تو مشرف اور اس کے کارندوں کو گالیاں دے کر دل کا غبار اتارا کرتے تھے۔ ادھر ریحانہ نے کبھی سیاست میں دلچسپی نہیں کی تھی اور شاذ و نادر ہی اخبار پڑھا کرتی تھیں۔ ٹیلی ویژن پر پاکستانی چینل آنا شروع ہوئے تو وہ صرف بالی ووڈ کی فلمیں یا ڈراموں والے چینل ہی دیکھا کرتی تھیں۔

''ہمیں حالات سے کیا غرض، میری دونوں بہنیں فیڈرل ایریا میں رہتی ہیں، ہم بھی وہیں کوئی اچھا سا مکان لے کر سکون سے رہیں گے۔ تمھارے بھی کئی جاننے والے کراچی میں ہیں۔''

''ہونھ، کراچی میں سکون سے رہیں گے؟ وہ اکرم صاحب کی بیگم کا واقعہ یاد نہیں؟ دن دہاڑے ٹیکسی روک کر ڈاکوؤں نے ان کا زیور اتروا لیا تھا۔ اور وہ ورلڈ بینک والے فواد صاحب۔ دو ہفتے کے لیے پاکستان گئے تھے، جس گلی میں ان کی ساری زندگی گذری تھی، وہیں انھیں پستول کی نال پر لوٹ لیا گیا۔ نا بھئی نا، مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا کہ اس عمر میں کوئی مجھے راہ چلتے ہوئے ہینڈز اپ کروالے۔''

''تو یہ زندگی کون سی جنت ہے؟ پہلے تو سرمد کی تعلیم اور پھر اس کی نوکری کی وجہ سے زندگی کا سہارا تھا۔ اب اس کی یادیں ہر دیوار، ہر دراز، ہر الماری سے نکل کر مجھے ستاتی ہیں۔ تم صبح سویرے کام پہ چلے جاتے ہو اور شام کو واپس آ کر ڈھائی سیر کا اخبار لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ پاکستان میں کم از کم کوئی بات کرنے والا تو ہوگا۔'' ریحانہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''ریحانہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب وہ پچیس سال پہلے والا پاکستان نہیں رہا۔ اب وہاں بھی کسی کے پاس فالتو وقت نہیں رہا۔ کسی سے ملنے کے لیے جاؤ تو پہلے فون کر کے ٹائم لینا پڑتا ہے۔ اور پھر تم بیمار ہو۔ یہ بھول جاؤ کہ تمھارے رشتے دار تمھارا خیال رکھیں گے۔ یہاں ہر روز فزیکل تھراپسٹ گھر آ کر مفت تھراپی کر جاتا ہے۔ ڈایالسس کے لیے ایمبولنس خود گھر آ کر تمھیں ہسپتال لے جاتی ہے۔ وہاں تو حالت یہ ہے کہ

ایمبولنس ٹریفک جام میں تین تین گھنٹے پھنسی رہتی ہے اور مریض تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ ہسپتالوں میں بجلی نہیں، آلات نہیں، ڈاکٹر نہیں۔''

''اور تمھاری فیملی؟'' انصاری نے پوچھا۔

''ہاہاہا، فیملی ویملی کوئی نہیں۔ باپ کا تو پتہ نہیں کہ کہاں ہے، کیوں کہ وہ تو میری پیدائش سے پہلے ہی میری نوعمر ماں کو چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا تھا یا مر کھپ گیا تھا۔ ماں بھی ہر وقت نشے میں اس قدر دھت رہتی تھی کہ اسے خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔''

''کوئی بھائی بہن؟''

''ایک چھوٹا بھائی ہے، جس سے آخری بار کوئی دس سال پہلے آخری بار بات ہوئی تھی۔ وہ نیویارک میں وکیل ہے، کسی فرم میں کام کرتا ہے۔ اسے ہم جیسوں سے تعلق رکھنے میں شرم آتی ہے، اس لیے میں بھی اس سے ملنا ملانا چھوڑ دیا۔'' ڈیوک کے لبوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''شادی وادی نہیں کی تم نے؟''

''شادی؟'' ڈیوک نے اپنے ماتھے کی شکنوں کو مزید گہرا کرتے ہوئے مصنوعی حیرانی سے پوچھا جیسے اسے اس لفظ کے معنی سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی ہو۔ ''نہیں نہیں، ہم نے کبھی یہ جھنجھٹ پالا ہی نہیں۔ ہاں کسی زمانے میں ایک گرل فرینڈ تھی، اس سے کچھ عہد و پیماں بھی ہوئے، لیکن ظاہر ہے کہ میری طرز زندگی میں کوئی طویل رشتہ پالنا ناممکن ہے۔''

انصاری کا ایک اور مسئلہ بھی تھا، جسے وہ ریحانہ کو بتاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وہ جب الہٰ آباد سے اپنے والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے، اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ انھوں نے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کر لیا تھا اور پانچویں میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ والدین نے انھیں اسکول سے اٹھا لیا، کیوں کہ حالات روز بہ روز بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی لگ گئی، کیوں کہ شہر سے لوٹ مار اور فساد کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ انصاری کو بہت کوفت ہوئی، کیوں کہ ان کے سارے دوست چھوٹ گئے تھے۔ وہ سارا دن اکیلے گھر میں پڑے رہتے۔ حالات کسی قدر بہتر ہوئے تو یہ خاندان پاکستان چلا آیا۔ نئے وطن میں آنے کے بعد انصاری کو نئے سرے سے دوستیاں بنانی پڑی تھیں، اسکول میں بھی اور کراچی کی پیر الٰہی بخش کالونی میں واقع اپنے محلے میں بھی۔ باقی رشتے دار ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے۔ ان کے ساتھ شروع میں خط و کتابت رہی لیکن والدین کے انتقال کے بعد تمام رابطے ٹوٹ گئے۔ اب تو یہ عالم تھا کہ انصاری کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ان کی دو پھوپھیاں ابھی زندہ ہیں یا نہیں۔ دوسری ہجرت اختیاری تھی، جب وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ چھاڑ کر امریکہ میں آن بسے تھے۔ یہاں تو صورت حال یہ تھی کہ شروع کے کئی مہینے انھیں گھر سے باہر اردو میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، کیوں کہ

کوئی تھا ہی نہیں جس سے اپنی زبان میں بات کی جا سکے۔ پھر سالہا سال گذرتے رہے اور رفتہ رفتہ وہ یہاں کی زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ صبح سے شام اسٹور میں، شام کو گھر میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ۔ اختتام ہفتہ پر کسی پاکستان کے گھر چلے جانا، یا کسی کو اپنے گھر بلا لینا۔ یہ ان کے معمولات بن گئے تھے۔ اب انھیں ایک بار پھر اس بنی جمی زندگی کو اکھاڑ کر ایک اور ہجرت کرنا سوہان روح لگتا تھا۔ لیکن یہ ساری باتیں بیگم کو کون سمجھائے؟ انصاری اور بیگم کے درمیان اس قسم کی نوک جھونک روز کا معمول تھی۔ لیکن کچھ عرصے سے بیگم کی باتوں کی کاٹ میں تیزی اور انصاری کے دلائل کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ بیگم کو معلوم تھا کہ انصاری اپنی ہٹ کے پکے ہیں۔ ادھر انصاری بھی اپنی بیگم کا دکھ سمجھتے تھے، لیکن اس کا کوئی حل ان کے پاس نہیں تھا۔

''ویسے بڑے میاں، تم بھی بڑی چیز ہو۔ مجھ سے تو ساری باتیں اگلوا لیں، خود صاف گول کر گئے کہ تمھیں کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟'' ڈیوک نے کہا، ''شکل سے عادی مجرم تو نظر نہیں آتے تم مجھے؟''

انصاری نے ڈیوک کی اپنی کہانی سنانے کے لیے اپنے ذہن میں خیالات ترتیب دینا شروع کر دیے۔

''کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ بس ذرا بیگم سے لڑائی ہو گئی۔ اوپر سے پولس پہنچ گئی اور اب میں تمھارے سامنے ہوں۔'' انصاری نے ایک ہی سانس میں یہ کہہ کر گویا کوئی بوجھ اپنے سر سے اتارنے کی کوشش کی۔

''نہیں نہیں، شروع سے سناؤ۔ فکر نہ کرو، میرے اور تمھارے پاس بہت وقت ہے۔ کل اور پرسوں تو ویسے بھی چھٹی ہے۔ اگر تمھیں لینے کے لیے کوئی آیا تو پیر کے دن ہی آئے گا۔''

انصاری کو وقت کا خیال آیا۔ ان کی گھڑی پولس والوں نے ضبط کر لی تھی، اس لیے انھیں وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ انھوں نے تخمینہ لگایا کہ ان کی ہتھ کڑیاں لگے کم از کم تین گھنٹے گذر گئے ہیں۔ ان کے ذہن میں وہ منظر گھومنے لگا جب پولس والے نے پھرتی اور مہارت سے ان کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پہنا کر انھیں کلک کی آواز کے ساتھ بند کر کے چابی جیب میں ڈال لی تھی۔ اس کے ساتھی نے اپنے بٹوے میں سے پیلے رنگ کا چھوٹا سا کارڈ نکالا اور اسے سیاہ فام امریکیوں کے مخصوص لہجے میں با آواز بلند پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

''تمھارے پاس خاموش رہنے کا اختیار ہے۔ تم جو کچھ کہو گے، وہ تمھارے خلاف عدالت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تمھیں اپنے وکیل سے بات کرنے کا اختیار ہے۔ اگر تم وکیل کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے تو تمھیں سرکار کی طرف سے وکیل فراہم کیا جائے گا۔''

انصاری سکتے کی حالت میں سنتے رہے۔ پولس والے نے جب دوسری بار اپنی بات دہرائی، ''تمھیں اپنے حقوق کی سمجھ آ گئی ہے؟'' انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن خشک ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ انھوں نے سر ہلا دیا۔

یہ کارروائی مکمل کرنے کے بعد پولس والا انھیں شانے سے پکڑ کر قریب ہی کھڑی ہوئی پولس کار کی طرف لے گیا اور پچھلی نشست پر انھیں بٹھا کر ساتھ خود بیٹھ گیا۔ کار کی چھت پر سرخ اور نیلی بتیاں جل بجھ رہی تھی، البتہ سائرن بند تھا۔ گاڑی کی کھڑکیوں پر سیاہ آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ اور ڈرائیور والی سیٹ کے درمیان بھی باریک سلاخیں نصب تھیں۔ دوسرے پولس والے نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ انصاری کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی آنکھ اس ڈراؤنے خواب سے جلد ہی کھل جائے گی۔ پولس کی گاڑی، دونوں پولس والے، سڑک پر چلنے والی دوسری گاڑیاں انھیں غیر حقیقی معلوم ہو رہی تھیں۔ قریب سے سرخ رنگ کے کھلے چھت والی کار گذری۔ گاڑی میں دو لڑکیاں کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ ڈرائیور کی ساتھ والی نشست پر بیٹھی ہوئی گھنگھریالے بالوں والی ایک لڑکی کی نظریں ایک لمحے کو انصاری سے ملیں تو انصاری نے گھبرا کر فوراً منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ انھوں نے سوچا، کیا اس لڑکی کو معلوم ہو گا کہ انھیں کس قدر تحقیر کے عالم میں ایک انتہائی معمولی سی بات پر گھٹیا مجرموں کی طرح ہتھ کڑی لگا کر لے جایا جا رہا ہے؟ انھوں نے شکر کیا کہ گاڑی کا سائرن آن نہیں کیا گیا ورنہ اور شرمندگی ہوتی۔ پولس والے نے ہتھ کڑیاں اتنی کس کر باندھی تھیں کہ وہ بری طرح سے ان کی کلائیوں کی ہڈیوں میں چبھ رہی تھیں۔ دوسری طرف ہاتھ پشت پر کیے ہوئے سیٹ پر بیٹھنا الگ سے تکلیف دہ تھا لیکن انھوں نے منھ سے ایک حرف نہیں نکالا اور خاموشی سے بیٹھے رہے۔

انصاری کو لیے ہوئے پولس کی گاڑی کیپیٹل بیلٹ وے کے نیچے سے گذری، پھر الیگزینڈریا نیشنل قبرستان کے پاس سے ہوتی کنگ اسٹریٹ کے علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ڈیوک اسٹریٹ کے قریب سفید رنگ کی ایک عمارت کے قریب ایک جھٹکے سے جا رکی۔ عمارت کی پیشانی پر ''الیگزینڈریا نیبر ہڈ واچ'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ پولس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور منھ سے کچھ بولے بنا انھیں سر سے اشاہ کیا۔ انصاری بڑی مشکل سے گاڑی سے باہر اترے، کیوں ہتھکڑیوں کی وجہ سے ہاتھ کا سہارا نہیں لے سکتے تھے۔ انھوں نے پولس والے کے مشورے پر پہلے دونوں پاؤں باہر نکال کر زمین پر جمائیں، پھر باقی دھڑ گاڑی کی نشست سے بلند کیا، اس دوران وہ لڑکھڑا گئے لیکن پولس والے نے انھیں سہارا دے کر اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ انصاری شروع ہی سے چھریرے بدن کے مالک تھے، لیکن پچھلے آٹھ دس سال میں ان کا وزن خاصا بڑھ گیا تھا۔ شروع میں تو انھوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی، کیوں کہ ساری زندگی دبلے پتلے رہنے کی وجہ سے انھیں یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ کبھی موٹے نہیں ہو سکتے۔ جب پتلونیں چھوٹی پڑ گئیں اور توند نکل آئی تب انھیں احساس ہوا لیکن شاید اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے ''تن بہ تقدیر'' کے کلیے پر عمل کرتے ہوئے اس طرف توجہ دینی ہی چھوڑ دی۔

حوالات کا بھاری دروازہ پُر شور طریقے سے کھلا اور ایک اہلکار ٹرالی گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ٹرالی میں سفید پلاسٹک کی پلیٹیں تھیں، جن میں خانے بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک پلیٹ انصاری کو بھی تھما

دی۔ پلیٹ میں ایک کچا کیلا اور المونیم کے ورق میں لپٹا ہوا سینڈوچ تھا۔ ڈیوک نے پلیٹ اپنے گھٹنوں پر رکھ لی اور ورق میں سے سینڈوچ نکال کر کھانے لگا۔ انصاری کا خیال تھا کہ وہ شاید کھانا نہیں کھا پائیں گے لیکن حیرت انگیز طور پر انھیں احساس ہوا کہ انھیں خاصی بھوک تھی۔ معلوم نہیں کس چیز کا سینڈوچ تھا لیکن انصاری نے پروا کیے بغیر کھانا شروع کر دیے۔ ڈیوک نے بھی بہت رغبت سے اپنا کھانا ختم کیا اور پھر نیپکن سے منھ پونچھتے ہوئے انصاری کی طرف مڑا۔

''ہاں تو بڑے میاں، تم کہہ رہے تھے کہ بیوی سے لڑائی ہوگئی؟''

انصاری اپنی کہانی سناتے رہے۔ اس دوران دو تین بار دروازہ کھلا اور یا تو کچھ لوگ اندر لائے گئے یا کچھ اندر سے باہر لے جائے گئے۔ ڈیوک نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا تھا، تاہم اس کے کان پوری طرح انصاری پر لگے ہوئے تھے۔

''میں نے کہا نا کہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔'' انصاری ذاتی باتیں خود تک محدود رکھتے تھے۔ پاکستان میں بھی ان کے دوست بھی ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ اور ان دوستوں کے ساتھ بھی کچھ زیادہ بے تکلفی نہیں تھی، اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے وہ تم کہہ کر مخاطب کرتے ہوں۔ لیکن آج وہ جس ذہنی صدمے سے گذرتے تھے، اس سے ان کی شخصیت کے گرد قائم مضبوط فصیل میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ڈیوک کو تفصیل بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے، حالاں کہ اس سے ملے ہوئے ابھی شاید ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے کہانی سنانا شروع کر دی۔

''آج موسم بہت اچھا تھا۔ میں بیوی کو لے کر باہر نکلا کہ باہر کسی ریستوران میں کھانا کھائیں گے، اور پھر دریا کے کنارے پارک میں بینچ پر بیٹھ کر سہ پہر گذاریں گے۔ لیکن ریستوران جاتے جاتے گاڑی ہی میں تو تو میں میں ہوگئی۔''

''رکو نہیں، بولتے جاؤ۔''

''میں نے ایک گاڑی کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی تو بیوی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی۔ کہنے لگی کہ تم نے گاڑی لہرا کر کیوں اوورٹیک کی۔ میں نے بہت سمجھایا کہ اگلی گاڑی میں ایک بوڑھی عورت تھی جو گاڑی کو مقررہ حد سے دس میل کم رفتار پر چلا رہی تھی، لیکن بیوی کا پارہ چڑھتا گیا اور جو اس کے منھ میں آیا وہ کہتی گئی۔ حتیٰ کہ ریستوران کے قریب پہنچ کر ہم گاڑی سے اتر آئے، پھر بھی اس کے لعن طعن کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔''

''تو تم طعنے سنتے رہتے، یہ تو دنیا کے ہر مرد کے نصیب میں لکھا ہوا ہے۔'' ڈیوک نے دھیرے سے کہا۔

''میں بھی سنتا ہی رہا۔ پھر میں نے گاڑی پارک کرنے کے بعد دوسری طرف جا کر بیگم کو باہر نکلنے میں مدد دی۔ جب سے اس کے گھٹنے کا آپریشن ہوا تھا، اسے گاڑی میں بیٹھتے اترتے بہت دقت ہوتی تھی لیکن وہ گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بھی مسلسل بڑبڑاتی رہی۔ 'بڑھیا تھی وہ؟ کم بخت بڑھیا تھی؟ تم بھی عمر میں اس

سے کم نہیں ہو، شاید دو چار سال زیادہ ہی ہو گے۔ لیکن گاڑی اس طرح چلاتے ہو جیسے موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلا رہے ہو۔''

''بولتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔'' ڈیوک نے کہا۔

''میں نے اسے بہت کہا کہ بھول بھی جائے اس بات کو، جانے دے، لیکن وہ تو جیسے ہتھے ہی سے اکھڑ گئی تھی۔ بولتی گئی، بولتی گئی۔''

''پھر؟'' ڈیوک نے آنکھیں موند کر دیوار سے سر ٹیکتے ہوئے پوچھا۔

''بس اس کے بعد اس نے گفتگو کا سلسلہ میری ڈرائیونگ کی طرف موڑ دیا۔ کہنے لگی کہ میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ مجھے تمھاری تیز ڈرائیونگ سے خوف آتا ہے لیکن تم نے کبھی میری بات سنی۔ زندگی بھر تم نے من مانی کی ہے۔ جو تمھارے دل میں آتا ہے تم وہی کرتے ہو۔ یہ کہتے کہتے اس کی آواز اونچی ہوگئی۔ دو تین لوگ گاڑیوں سے نکل رہے تھے، انھوں نے بھی گردنیں موڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا، لیکن بیوی کا قصیدہ جاری رہا۔''

''ٹھیک ہے۔ آگے؟''

''خیر یہاں تک تو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، لیکن جب اس نے یہ کہا کہ سرمد کو بھی تم ہی نے زندگی کو ریش طریقے سے گذارنے کی پٹی پڑھائی تھی اور تمھارے ہی نقش قدم پر چل کر وہ آج قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے سو رہا ہے، تو میرا دماغ پھر گیا۔''

''سرمد کون؟''

''ہمارا بیٹا۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''کیا بتاؤں؟'' انصاری نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا، ''فوت ہو گیا چار سال پہلے۔''

''ارے!'' ڈیوک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیسے؟''

''بس کیا کہوں کیسے؟'' انصاری نے کہا۔ ''پتہ نہیں اسے کہاں سے موٹر سائیکلوں کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی ساری آمدنی موٹر سائیکلوں پر خرچ کرتا تھا۔ چھٹیوں میں دوستوں کے ساتھ نکل جاتا تھا اور جانے کہاں کہاں گھومتا رہتا تھا۔ ایک شام کو بارش ہو رہی تھی کہ اس کے دوست آ کر اسے ساتھ لے گئے۔ تین لڑکے تھے اور ایک عورت۔ چمڑے کی جیکٹیں، چمڑے کی پتلونیں اور چمڑے کے دستانے۔ بے ہنگم شکلیں، بڑی بڑی مونچھیں اور بے ترتیب داڑھیاں۔ میں نے منع بھی کیا لیکن اس نے کہا بس گھنٹے بھر میں واپس آ جاؤں گا۔ گھنٹے سے پہلے ہی ہسپتال سے فون آ گیا۔''

''اوہو! بہت افسوس ہوا۔ اور کوئی بچے؟''

''اور کوئی نہیں۔''

''اوہ۔''

''اچھا پھر پارکنگ لاٹ میں کیا ہوا؟'' ڈیوک نے پوچھا۔

حوالات کا دروزہ ایک بار پھر کھلا اور ایک سارجنٹ نے بلند آواز میں پکارا۔

''این سیری، این سیری۔'' انھیں امریکہ میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ نام کے بعد بھی کچھ کہا لیکن انصاری کو اس کی سمجھ نہیں آئی۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارجنٹ نے اندر آکر انھیں اور دو دوسرے قیدیوں کو پھر ہتھکڑیاں لگا دیں اور پھر ہتھکڑیاں ایک زنجیر کی مدد سے ایک دوسرے سے منسلک کردیں۔ اب ان تینوں کی ہر حرکت ایک دوسرے کے تابع ہوگئی تھی۔ پولس والے تینوں کو لاکر عمارت سے باہر کھڑی وین میں بٹھا دیا۔ وین کے اندر آمنے سامنے سیٹیں تھیں۔ کھڑکیوں پر سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ شیشے سیاہ تھے جس کی وجہ سے باہر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا اور ویسے بھی اس وقت تک گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ انصاری اور دونوں قیدی ایک طرف جب کہ سامنے والی سیٹ پر دو پولس والے بیٹھے گئے۔ سفر خاصی دیر تک جاری رہا۔ انصاری نے گاڑی کی رفتار سے اندازہ لگایا کہ شاید وہ ہائی وے پر سفر کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں انھیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ انھوں نے پولس والوں سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے صرف اتنا کہہ کر خاموش کرا دیا، ''خود پتہ چل جائے گا۔''

کم از کم دو گھنٹے کے سفر کے بعد انصاری کو ایک بار پھر لمبی چوڑی کاغذی کاروائی سے گذرنا پڑا۔ انگلیوں کے نشان، تصاویر، معلومات کا اندراج۔ تاہم ایک فرق یہ تھا کہ اب کی بات انھیں پلاسٹک کے بیگ میں کچھ سامان بھی تھما دیا گیا۔ ایک جوڑا کپڑے، ہوائی چپل، ایک ننھا سا ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ کے تین چار چھوٹے چھوٹے پیکٹ اور ایک ٹافی کے سائز کا چوکور صابن۔ یہ حوالات نہیں بلکہ باقاعدہ جیل تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں ایک کمرہ اور بستر بھی الاٹ کر دیے گئے۔ جیل کے داخلے سے پہلے تلاشی کے ایک بے حد ناخوش گوار بلکہ شرمناک عمل سے گذرنا پڑا، جسے انصاری مرگ مفاجات کے تحت چپ چاپ سہہ گئے۔ پھر ان کا میڈیکل ہوا، بیماریوں کی تفصیل پوچھی گئی۔ آخر میں انھیں ایک کمرے میں لاکر چھوڑ دیا گیا جہاں چھ بستر تھے، لیکن کمرے میں ایک ہی شخص موجود تھا۔ اس کی عمر بیس سے زیادہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا، جیسے کسی نے اسے تھپڑوں کا نشانہ بنایا ہو۔ وہ ویت نامی تھا اور اسے انگریزی نہ آنے کے برابر آتی تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھ گفتگو ہیلو ہائے سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ انصاری اپنے بستر پر لیٹ گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ ساری رات دوسرے کمروں سے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آتی رہیں۔ انھیں لگا جیسے بار بار بلند آواز سے نعرے بلند کیے جا رہے ہیں جس کے بعد تالیاں اور سیٹیاں بجائی جاتی تھیں۔ ایک بار تو قریب ہی کسی وارڈ میں ہنگامہ سا پھوٹ پڑا اور درجنوں لوگ بلند آواز سے ''اوباما۔ اوباما'' کی گردان کرنے لگے۔ یہ ہنگامہ اس وقت اور زور پکڑ گیا، جب غالباً کسی محافظ نے آکر سخت لہجے میں گالیاں دے کر انھیں چپ کرانے کی کوشش کی۔ جواب میں گالیوں کا طوفان آیا اور ساتھ ہی، ''اوباما۔ اوباما'' کی گردان بھی جاری رہی۔ نہ جانے کب تک یہ ہلڑ بازی چلتی رہی۔ رات کے کسی پہر میں انصاری نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

اگلے دن ناشتے میں گتے کے کپ میں کڑوی کافی اور ساتھ میں دو توس ملے۔ بعد میں قیدیوں کو ورزش کے لیے لے جایا گیا۔ انصاری کے سر میں شدید درد تھا لیکن دو بار محافظ سے درخواست کرنے پر بھی انھیں ڈسپرین یا ٹائیلو ینول نہ مل سکی۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں لیٹے رہے۔ اگلے سر کا درد تو رفع ہو گیا لیکن وہ کھانے اور ورزش کے اوقات کے علاوہ کمرے سے باہر نہیں نکلے اور بستر پر لیٹے رہے۔

پیر کی شام کو وہ ٹیلی ویژن کے کمرے میں گئے تو کسی نے اچانک پیچھے سے ان کے کندھے پر دھول مارا۔ مڑ کر دیکھا تو ڈیوک تھا۔

''اے بڑے میاں! تمھارا خیال تھا کہ تم مجھ سے بچ نکلو گے۔ دیکھو کہاں آکر پکڑ لیا میں نے تمھیں۔''

انصاری کو ایسا لگا جیسے ان کا کوئی پرانا بچھڑا ہوا عزیز مل گیا ہو۔

''ارے بھائی، تم یہاں کیسے؟''

''بس دیکھ لو۔ یہ لوگ ہمیں ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتے، ادھر اُدھر گھماتے پھراتے رہتے ہیں۔''

انصاری اور ڈیوک ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک پولس اور جیل کی انتظامیہ کو مغلظات سے نوازنے کے بعد ڈیوک نے کہا، ''وہ تمھارا قصہ بیچ ہی میں رہ گیا تھا۔ تم کہہ رہے تھے کہ بیوی سے لڑائی ہوگئی مگر کیسے؟''

انصاری خود پورا واقعہ سنانے کے متمنی تھے اور انھیں کسی قدر کوفت ہوئی تھی جب انھیں اچانک بیچ میں اٹھا دیا گیا تھا۔

''اوہ ہاں، میں نے تمھیں کہاں تک بتایا تھا؟ جب میں بیگم کے ساتھ ریستوران کے پارکنگ لاٹ میں پہنچا؟''

''ہاں! پھر کیا ہوا؟'' ڈیوک نے پوچھا۔

''میں نے ساری زندگی ایک ہی کام سیکھا تھا، اپنے جذبات پر قابو رکھنا۔ لیکن جب اس نے سرمد کا ذکر کیا اور اس کی موت کے لیے مجھے قصوروار ٹھہرانا چاہا تو مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میرا ہاتھ کیسے گھوم گیا۔ دوسرے لمحے دیکھا تو وہ پارکنگ لاٹ کے فرش پر بیٹھی ہوئی زور زور سے چیخ رہی تھی۔''

''ہوں۔ پھر؟''

''ہماری شادی کو چالیس سال ہوگئے ہیں لیکن میں نے کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ لیکن پتہ نہیں میرا دماغ بالکل سن ہو گیا تھا، مجھے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ وہ بیمار ہے اور بے حد لاغر ہے۔''

''ہاں، لیکن جو حالات تم بتا رہے ہو، اس میں یہ بعید بھی نہیں۔ تو پھر پولس کیسے پہنچی۔''

''پتہ نہیں، میں بیوی کو اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو دیکھا کہ ادھر اُدھر سے چند لوگ قریب آگئے ہیں اور مدد کی پیشکش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی نے فون ملا کر کسی سے بات کرنا شروع کر دی۔ میں نے بیوی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے کہا بھی کہ تماشا نہ بناؤ

لیکن اس نے میری بات نہ سنی۔''

''تو کیا ان سالوں میں سے کسی نے پولس کو فون کر دیا؟''

''یہی ہوا ہوگا، کیوں کہ تین چار منٹ کے اندر اندر پولس کار پہنچ گئی اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مجھے پکڑ کر ہتھکڑی لگا دی۔''

انصاری کوئی بہتر گھنٹے اس جیل میں رہے۔ اس دوران انھوں نے امریکی جیلوں کی زندگی کے بارے میں چھ بے حد اہم سبق سیکھے:

(۱) جیل میں تمام لوگ معصوم ہوتے ہیں، انھیں کسی نہ کسی غلط فہمی یا کسی دشمن کی سازش، پولس کی چال، نسل پرستی یا اس جیسے کسی اور ناکردہ گناہ کی سزا کے طور پر گرفتار کیا جاتا ہے۔

(۲) جیل میں دو سب سے زیادہ پوچھے جانے والے سوال؛ تم یہاں کس جرم میں بند ہو، اور پہلے کتنی بار جیل کاٹ چکے ہو؟

(۳) جیل کے محافظ جنھیں اصلاحی آفیسر کہا جاتا ہے؛ دنیا کی سب سے گھٹیا، ذلیل اور قابل نفرت مخلوق ہیں اور ان میں بھی خواتین اہلکار خاص طور پر بدتر ہیں۔

(۴) جیل کے اندر جوا، منشیات، سودخوری، غرض ہر قسم کا کالا دھندا دھڑلے سے ہوتا ہے۔

(۵) جیل میں ہر کوئی ہر کسی کو گالی دے کر مخاطب کرتا ہے۔ سب سے عام گالی ''نِگر'' ہے۔

(۶) جیل کسی ناکارہ ٹائم مشین کی طرح کام کرتی ہے۔ یہاں گذارا ہوا ایک دن باہر کی زندگی کے ایک ہفتے کے برابر ہوتا ہے۔

اسی شام انصاری کو اطلاع ملی کہ ان کی ملاقات آئی ہے۔ وہ ملاقاتی کمرے میں گئے تو دیکھا کہ ریحانہ کرسی کا سہارا لیے مسکراتی ہوئی انھیں دیکھ رہی ہے۔ ساتھ ہی گرے کوٹ اور اسکرٹ پہنے ایک دراز قامت سنہرے بالوں والی عورت ہاتھ میں فائل تھامے کھڑی تھی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے انصاری سے ہاتھ ملایا۔

''میرا نام سلویا ہے۔ میں آپ کی وکیل ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس قدر وقت یہاں گذارنا پڑا لیکن ہم بہرصورت کل آپ کو عدالت میں پیش کر کے ضمانت حاصل کر لیں گے۔''

انصاری نے بیگم کی طرف دیکھا، ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن ان کے پتلے پتلے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ ان کے منھ سے صرف اسی قدر بات نکل سکی، ''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

اس دوران ایک محافظ نے آ کر ملاقات کا وقت ختم ہونے کی اطلاع دی۔ سلویا نے اپنی فائل میز سے اٹھا کر بغل میں دبالی اور جاتے جاتے انصاری کو چند ہدایات دیں۔ انصاری خالی الذہن کے عالم میں

سنتے رہے، تاہم ایک بات پر وہ چونک گئے۔ سلویا کہہ رہی تھی، ''ہر ممکن طریقے سے دوسروں سے الگ تھلگ رہیں۔ خاص طور پر کسی بھی ایسے شخص سے بات نہ کریں جو اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ ہمدرد بنا کر پیش کرے۔ دس میں سے نو ایسے لوگ مخبر ہوتے ہیں اور سگریٹ کی ایک ڈبیا کے عوض آپ کے راز پولس تک پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں سے بچ کر رہیں۔ آپ سمجھ گئے ناں؟'' وکیل نے انصاری کا تاثرات سے عاری چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''بالکل، بالکل، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔'' انصاری نے جلدی سے کہا اور دروازہ کھول کر محافظ کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ جیل کی زندگی کے بارے میں ان کا ساتواں اہم ترین سبق تھا۔

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس وضمیر کے سکون کا تھا، جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ وارشادات سے بلند تھا، جب دین حنیف میں جبر واکراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارا نہ کیا جاتا تھا اور جب عہد بنی عباس میں آزادی کے ساتھ ہر شخص کو اسلام کا صحیح مفہوم جاننے کے لیے جرح و تنقید کی اجازت تھی۔ لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ اس قدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں، اگر آج غزالی اور رازی زندہ ہوتے تو ان کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا۔ غضب خدا کا میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت وجبروت اور اس کی قوت وقدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ رسول کی صداقت وبلندیٔ فطرت پر جس طرح ایمان لایا ہوں، شاید ہی کوئی ایمان لایا ہو، لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں، ملحد ہوں، مرتد ہوں، پھر اگر اسی اقرار وعقیدہ کا نام کفر والحاد ہے تو:

نازم بہ کافری کہ بہ ایماں برابر است

لاؤ، ساری دنیا کی بے دینی مجھے دے دو، تمام عالم کا ارتداد میرے حوالے کر دو اور کائنات کے ہر ہر گوشے کا الحاد میرے قلب میں بھر دو کہ اس دولت کے ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بنائے بغیر نہیں جاسکتا۔

علامہ نیاز فتح پوری

''من ویزداں''

جنسی شناخت کا ایک اور پہلو

سعید اختر ابراہیم

ہم جنسیت ایک معاشرتی، عضویاتی اور نفسیاتی معاملہ ہے۔ بعض علمائے تحلیل نفسی کہتے ہیں، ''ہر شخص فطری طور پر دو جنسی ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ نے اس بات کی توثیق کچھ یوں کی ہے، ''میں نے کسی بھی ایک مرد یا عورت کا تجزیہ نہیں کیا جس میں ہم جنسی کا میلان موجود نہ ہو۔'' کچھ لوگ ہم جنسیت کو ایبنارمل یا نفسیاتی مرض سمجھتے ہیں، لیکن معروف مفکر ہیویلاک ایلس کے خیال میں، ''ہم جنسیت کسی بھی نفسیاتی مرض کی علامت نہیں ہے۔'' کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ ہم جنسیت کا رجحان مغرب کا پیدا کردہ ہے، جب اس کے نقوش قدیم ترین اقوام میں بھی ملتے ہیں۔ مورخین کی رائے میں ہم جنسیت کی ابتدا مصر سے ہوئی، جہاں دیوی ماتا آئسس کے معبد میں ہیجڑے پجاری ہوا کرتے تھے، جن سے زائرین اپنی تفریح طبع کا سامان پیدا کر لیتے تھے۔ عہد نامہ قدیم کے باب پیدائش میں لکھا ہے، ''جب دو فرشتے سدوم کو تباہ کرنے آئے تو حضرت لوط کے گھر ٹھہرے، جہاں سدومیوں نے انھیں گھیر لیا اور شور مچایا کہ اے لوط، انھیں باہر بھیجو۔'' قدیم چین اور جاپان میں بھی ہم جنس مردوں کے قحبہ خانے موجود تھے۔ جاپانیوں کا خیال تھا، ''ہم جنس پرست دلیر اور شجاع'' ہوتے ہیں۔ یونان کے امرا اور رؤسا ہم جنسوں کے قحبہ خانوں میں جانا اپنی شان سمجھتے تھے۔ اہل یونان نے امرد پرستی کو قومی اور تعلیمی ادارہ بنا لیا اور ہم جنسیت ان کے معاشرے، مذہب، فلسفہ، قانون اور شعر و ادب میں نفوذ کر گئی۔ افلاطون ایک سمپوزیم میں یہ کہنے تک سے دریغ نہیں کرتا، ''وہی نوجوان جو ہم جنس عشق کا تجربہ رکھتے ہوں، اچھے سیاست دان بن سکتے ہیں۔''

یہ ''علت مشائخ'' کیا ہے؟ فقہی و دینی کتب میں اس اصطلاح کے حوالے سے جو باب باندھا گیا ہے، وہ اس بات کی شہادت ہے کہ دیندار طبقہ بھی ہم جنسی رویوں سے مغلوب رہا ہے۔ تاریخ میں ایسے ہوش ربا واقعات درج ہیں۔

خلیفہ ہارون اور جعفر کی محبت تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ہارون نے ایک ایسا فرغل بنوایا ہوا تھا جس کے دو گریبان تھے، اسے پہن کر وہ ایک جان دو قالب بن جاتے تھے۔ ہارون کا بڑا بیٹا امین بھی ہم جنس پرست تھا، جو اپنے ایک غلام کوثر پر جان چھڑکتا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران جب مامون کی فوج کے سپہ سالار طاہر بن حسین کی فوج بغداد میں گھس آئی اور امین کی سپاہ کو شکست ہوگئی تو ایک مصاحب دوڑتا ہوا امین کے پاس پہنچا، جو اس وقت دریا کے کنارے اپنے محبوب کوثر کے ساتھ بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اسے شکست کی خبر دی گئی تو وہ سخت بدمزہ ہوا اور کہنے لگا، خدا تمھیں غارت کرے، دیکھتے نہیں کوثر نے دو مچھلیاں پکڑیں اور میرے ہاتھ ابھی تک ایک بھی نہیں لگی۔ سلطان محمود غزنوی کو مشتری چہرہ غلاموں سے عشق تھا۔ فضل بن احمد بھی اس شوق میں اپنے آقا کی پیروی کرتا تھا۔ عماد الدین اصفہانی 'تاریخ سلجوقیہ' میں لکھتا ہے، ''سلطان سنجر کی عادت تھی کہ جو غلام اسے پسند آ جاتا، اسے خرید کر وہ اس سے عشق کرتا تھا۔'' تزک بابری میں بھی ہم جنس عشق کے تذکرے ملتے ہیں۔ بابر اپنے ایک عزیز دوست کے بارے میں لکھتا ہے، ''سلطان محمود مرزا پابند صوم و صلوٰۃ تھا، لیکن اس نے کئی لونڈے رکھے ہوئے تھے۔ اس کی مملکت میں جہاں کوئی نوخیز اور حسین لونڈا دکھائی دیتا، وہ اسے قابو میں لانے کی کوشش کرتا۔ اس کے سرداروں کے بیٹے، حتیٰ کہ اس کے رضاعی بھائی اور ان رضاعی بھائیوں کے بیٹے بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔'' البیرونی کے بقول، ''کابل کے ہندو راجہ نے اسلام قبول کیا تو یہ شرط لگائی کہ وہ نہ تو گائے کا گوشت کھائے گا اور نہ لونڈوں سے عشق بازی کرے گا۔''

اردو غزل کا مرکزی محبوب بھی مذکر ہی ہے، میر صاحب 'عطار کے لونڈے' سے یوں ہی دوا نہیں لیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ معاشرے میں اس 'دوا' کو لینے کا رواج عام تھا۔ تاریخ کی کسی سے رشتہ داری نہیں ہوتی لیکن جب تاریخ کو بھی عقیدت کی عینک لگا کر پڑھا جاتا ہے تو اسے فتووں کی چادر میں لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مغرب ہو یا مشرق، مسلم ہوں یا غیر مسلم؛ سارے معاشرے ہم جنسیت کے بڑھتے رجحان سے خائف ہیں، حالاں کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ رواجاً تنقید کرنے کی بجائے مطالعاتی رجحان کو اس ضمن میں اپنایا جاتا اور مکالمہ کیا جاتا۔ سعید اختر ابراہیم نے زیر نظر مضمون میں اسی طریقۂ کار کو اپنایا ہے، آپ ان سے بے شک اختلاف کر سکتے ہیں لیکن جذباتیت کے سیل رواں میں بہہ کر 'ہونہہ' کر کے اس مکالمے سے منھ نہیں پھیرا جا سکتا۔

ہماری بندھی ہوئی نفسیات کا المیہ ہے کہ وہ ہمیں معمول سے ہٹ کر سوچنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم اسٹیریوٹائپس (Stereotypes) کے کھونٹے سے بندھے ہیں اور انھیں دنیا کا سب سے بڑا سچ

اور نارمل مظہر سمجھے بیٹھے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم صرف اپنی اور اپنے جیسے دوسروں کی فطرت کو ہی نارمل کا درجہ دیتے ہیں، اور اگر کسی کی فطرت ہم سے مختلف ہو تو ہم اسے نیچرل اور نارمل ماننے سے نہ صرف انکار کر دیتے ہیں بلکہ ایسے افراد کو اپنی فطرت کے اظہار کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ جب ہم ان معاملات کو اپنی محدود اور مذہبی عینک سے دیکھتے ہیں تو ہماری سوچ میں سختی اور تشدد کا عنصر بھی در آتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب ہم دلیل سے محروم ہو کر تجزیے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔

دنیا کا کوئی بھی معاشرہ ایسا نہیں جہاں ہم جنس مرد، ہم جنس عورتیں اور تیسری جنس کے حامل خواجہ سرا نہ پائے جاتے ہوں۔ سوائے جنسیت کے اختلاف کے ان گروہوں سے وابستہ افراد بالکل ویسے ہی اچھے یا برے، اعلیٰ و ادنیٰ، تخلیقی یا غیر تخلیقی ہوتے ہیں جیسے کہ ہم، جو اپنی جنسیت کی وجہ سے خود کو امتیازی طور پر 'نارمل' کا درجہ دیے بیٹھے ہیں اور محض اپنی اکثریت کی دھونس سے انھیں خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔

سوال ہے کہ یہ جو ہم اپنی جنسی شناخت کے نارمل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس میں ہمارا کیا کمال ہے؟ یہ تو سراسر ایک فطری معاملہ ہے جس میں ہماری کسی خواہش یا فیصلے کا ذرا بھی عمل دخل نہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم سے مختلف جنسی شناخت رکھنے والے لوگ فطرت کی تخلیق نہیں ہیں؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان گروہوں سے وابستہ افراد نے قدرت سے بغاوت کرتے ہوئے خود اپنی جنس کو ہم سے مختلف شکل میں ڈھال لیا ہے اور اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ان کو اس بغاوت کی سزا دی جائے؟

اگر ہماری سوچ یہی ہے تو یقین جانیے ہم سخت غلطی پر ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس مسئلے کا تعصب کی عینک اتار کر جائزہ لیا جائے؟

پہلی بات تو یہ عام جنسی شناخت سے ہٹی ہوئی شناخت کے حامل افراد جو مرد اور عورت کے معمول کے رشتے سے ہٹ کر اپنی جنسی تشفی پر خود کو مجبور پاتے ہیں، وہ خود سے ایسے نہیں بنتے بلکہ یہ وصف ان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ خواجہ سرا بنتے نہیں، بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ افراد کے حوالے سے یہ معاملہ مختلف ہو اور وہ سماجی وجوہات کی بنا پر خواجہ سرا بننے کی جانب مائل ہو جاتے ہوں۔

اگر ایسا ہے بھی تو ہم پھر بھی اس بات پر اصرار کریں گے کہ سماجی اثرات بھلے کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں، فرد کی سرشت میں ایسا بننے کا رجحان لازماً موجود ہوتا ہوگا۔ البتہ سماجی رویے اس رجحان کو انگیخت کر کے واضح شکل دینے کا کام ضرور کرتے ہیں۔ فرض کیجیے، اگر یہ انگیخت موجود نہ بھی ہو تو ہم ایسے فرد کی مختلف جنسی شناخت سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں؟ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں بھی وہ فرد مسلسل ایک خاص طرح کی بے چینی، کرب اور ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہوگا۔ میں ایسے کئی افراد کو جانتا ہوں جو ادھیڑ عمری تک گناہ کے تصور کے تحت اپنی جنسیت سے انکار کے عذاب میں مبتلا رہے۔ یہ نام نہاد نارمل جنسیت کے حامل افراد کے سماج کی ظالمانہ بے حسی ہے جو انسان کو انسان سمجھنے سے عاری ہے۔

ایک اور سوال بھی اٹھایا جانا ضروری ہے کہ ہم جو خود کو نارمل سمجھتے ہیں، آخر کن بنیادوں پر اپنے

سے مختلف سیکسوئیلٹی کے حامل افراد کو ابنارمل کہتے ہیں؟ صرف اس بنیاد پر کہ ان کی جنسی جبلت ہم سے ذرا مختلف انداز میں تسکین پاتی ہے؟ اگر آپ کو عورت کشش کرتی ہے تو اس میں آپ کا کیا کمال ہے؟ اور اگر ایک گے (Gay) کو عورت پُرکشش نہیں لگتی تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اگر یہ قصور ہے تو پھر اس کی ذمہ داری سیدھی سیدھی قدرت پر عائد ہوتی ہے کہ اس نے ہم جنسوں کی سرشت میں ٹیڑھ رکھ دی۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ الزام تراشی سے حل نہیں کیا جا سکتا، ہاں البتہ اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ ہمارے درمیان بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جن کی جنسی شناخت روٹین سے ہٹی ہوئی ہے۔ تو کیا اس سے اس بات کا جواز حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ان افراد کو اجتماعی جبر کے ساتھ مجرموں کی طرح چھپنے پر مجبور کر دیا جائے؟ آخر ہم کس دلیل کے ساتھ ان سے نفرت اور تضحیک کا رویہ رکھ سکتے ہیں۔ کیا ان میں اور آپ میں جنسی شناخت کے علاوہ کوئی اور فرق بھی ہے؟ کیا وہ تخلیقی ذہن کے مالک نہیں؟ کیا وہ روٹین کے کام سرانجام دینے سے معذور ہیں؟ کیا وہ عبادت گزار نہیں ہیں؟

اگر ان میں کچھ لوگ اچھے کردار کے حامل نہیں تو نام نہاد نارمل جنسیت کے حامل افراد میں بدکردار افراد کی تعداد ان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ آخر وہ آپ سے جنسیت کے علاوہ اور کس معاملے میں مختلف یا عجیب ہیں؟ اگر ہم مرد اور عورت کی جنسی شناخت کو بغیر کسی جبر کے تسلیم کرتے ہیں تو ان کی شناخت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ اس فطری اختلافی صورت کو تسلیم کرنے کی وجوہات اپنی اصل میں فطری ہیں یا سماجی؟

کیا آپ کوئی ایسی ڈش خوشی سے اور پیٹ بھر کے کھا سکتے ہیں، جسے دیکھتے ہی نہ صرف آپ کی بھوک مر جائے بلکہ اُلٹا متلی ہونے لگے، جبکہ پاس ہی آپ کی کوئی پسند کی ڈش بھی موجود ہو۔ اور اگر کوئی آپ کو حکماً ایسا کرنے پر مجبور کرے تو آپ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ کیا آپ اس سے اس کی دھونس کی دلیل طلب نہیں کریں گے؟ کیا آپ اس سے یہ نہیں کہیں گے کہ وہ آپ کو اس ڈش کو کھانے پر کیوں مجبور کر رہا ہے، جسے ہضم کرنا تو دور کی بات آپ زبان پر بھی نہیں رکھ سکتے؟ اگر آپ حکم دینے والے سے خوف زدہ ہیں اور مزید یہ کہ اس کی پشت پر اکثریت کی دھونس بھی کھڑی ہے تو پھر ایک ہی صورت بچتی ہے، اور وہ یہ کہ آپ بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔

غور کیجیے، کیا ہم نام نہاد نارمیلٹی (Normality) کے دعویدار اپنے سے مختلف جنس رکھنے والے انسانوں کے ساتھ ایسا ہی نہیں کر رہے۔ مجھے ایک ہم جنس پسند نے بتایا کہ عورتیں اس کے لیے ایک فیصد بھی کشش نہیں رکھتیں۔ ان کا جسم اسے بالکل بے جان ربر جیسا لگتا ہے، جسے چھو کر اس کی جنسی حس ذرا سا بھی ارتعاش محسوس نہیں کرتی، جبکہ ان کے انزال کے وقت ایسی متلی انگیز بدبو آتی ہے کہ کچھ دیر کے لیے باقاعدہ سانس روکنا پڑتا ہے اور پھر فراغت پاتے ہی باتھ روم کی جانب بھاگنا پڑتا ہے۔

یہ ایک شادی شدہ شخص کی کہانی ہے، جسے اس کے گھر والوں نے زبردستی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ بیوی کے ساتھ سیکس کرنا کسی عذاب جیسا تھا جو زبردستی اس پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ

سات برس بعد طلاق ہوئی تو ان صاحب کی اپنی فطرت کے خلاف اس رشتے سے جان چھوٹی۔ یہی معاملہ ہم جنس عورتوں کا ہے جنھیں دوسری عورتوں کے برعکس مردوں میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے دل کا انتخاب ان کی ہم جنس ہی ہوتی ہیں۔

پیٹ کی بھوک ہو یا سیکس کی، یہ ہر حال میں اپنی تسکین چاہتی ہے، ہمیں نہ تو یہ حق حاصل ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل کہ ہم کسی کی جبلت کی تسکین کے خلاف کوئی حکم صادر کر سکیں۔ ہاں البتہ اس تسکین کے لیے اختیار کیے گئے راستوں پر ضرور بحث ہو سکتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک سوال اٹھاتے چلیں اور وہ یہ کہ آخر مرد اور عورت آپس میں تعلق کیوں بناتے ہیں؟ کیا صرف اولاد کے لیے؟ یا اس کا محرک کوئی اور جذبہ ہے، جیسے کہ جنسی کشش۔ کیا آدم اور حوا نے پہلا جنسی تعلق اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے بنایا تھا یا اس کا محرک ان میں ظاہر ہو جانے والا جنسی جذبہ تھا؟

میرے خیال میں اگر معاملہ جنسی نہ ہوتا تو کھایا ہوا سیب یا گندم کا دانہ کبھی آدم اور حوا کے اولین سنجوگ کی علامت کا روپ نہ دھارتے۔ جدید سائنس نے تو ویسے ہی سیکس ریلیشن اور اولاد کی پیدائش کے دائروں کو بالکل الگ کر دیا ہے، سو اب سیکس نسل بڑھانے سے کہیں زیادہ صرف لطف لینے کا معاملہ ہے۔ یہ لطف ایک خاص وقت میں دو افراد کا سراسر ایک نجی معاملہ ہے، جس میں کسی تیسرے کو مداخلت یا فتویٰ بازی کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ کسی فرد کا کسی دوسرے کو زبردستی اپنے لطف کے لیے استعمال کرنا (بھلے وہ اس کی منکوحہ ہی کیوں نہ ہو) ایک سنگین سماجی جرم ہے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کتنے ایسے شوہر ہوں گے جو اپنی بیویوں سے ان کی مرضی کے خلاف نہ صرف سیکس کرتے ہوں گے بلکہ اس دوران ایسے طریقے اختیار کرتے ہوں گے جو ان کی بیویوں کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تکلیف دہ ہوتے ہوں گے، مگر وہ عورتیں سماجی دباؤ کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور ہوتی ہیں؟ اگر آپ نے پورن فلمیں دیکھ رکھی ہیں تو پھر مجھے اپنی بات سمجھانے کے لیے تفصیل میں جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ تو کیا ہم نے کبھی سوسائٹی کے اس ناجائز اور قابل نفرت دباؤ کو ختم یا کم کرنے کے بارے میں سوچا ہے، جس نے ممکن ہے خود ہماری اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہو، بلکہ عملی صورت حال یہ ہے کہ اگر کوئی عورت آواز اٹھاتی بھی ہے تو سوسائٹی کی ساری مردانگی اس کے مقابل اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ نارمل سیکسوئیلٹی کے دعویداروں کے ہاں ان سے مختلف جنسیت کے حامل افراد کے لیے نفرت کی حد تک ناپسندیدگی پائی جاتی ہے، اور یہ معاملہ ہماری سوسائٹی میں کچھ زیادہ ہی شدید ہے؛ مگر ان شریف لوگوں نے جواباً کبھی ایسا رویہ نہیں اپنایا، کیونکہ وہ اکثریت کی جابرانہ دھونس سے ڈرے ہوئے لوگ ہیں۔ سماج کی اجتماعی مروجہ سوچ اور اخلاقی معیار اکثر اپنے ہی اراکین کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی حقیقی ضروریات کی مخالف سمت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثریت سے ہٹ کر مختلف سیکسوئیلٹی کے حامل افراد کے لیے تو یہ صورتحال بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

عوام ہی نہیں، خواص کی سطح پر بھی فرد کی جنسی شناخت کا معاملہ سخت غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہم نے روٹین (Routine) سے ہٹی ہوئی جنسی شناخت کو خوامخواہ گناہ سے جوڑ دیا ہے، جبکہ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی علمی اور عقلی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ مذہبی افراد بنا کسی سنجیدہ تحقیق کہ اس موقف پر کھڑے ہیں کہ ہم جنسیت سماجی کج روی کا معاملہ ہے اور اس کی ابتدا حضرت لوط کی قوم سے ہوئی تھی، جبکہ سائنسی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ نہ صرف انسانوں میں یہ خلقی معاملہ موجود ہے بلکہ جانوروں کی ۱۵۰۰ کے قریب انواع ایسی ہیں، جن میں ہم جنسیت کا واضح میلان پایا جاتا ہے جن میں پینگوئن، چمپینزی اور ڈالفن شامل ہیں۔

گویا یہ معاملہ کسی سماجی کج روی کا نہیں، بلکہ جانوروں اور انسانوں کی فطرت کا ناگزیر حصہ ہے۔ سگمنڈ فرائڈ جسے جدید نفسیات کا باوا آدم مانا جاتا ہے، اس کے مطابق ہر فرد دونوں طرح کے جنسی رجحان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اگر اسے آزادانہ انتخاب کا موقع فراہم کیا جائے تو پھر وہ خود سے طے کر سکتا ہے کہ اسے کس صنف کے ساتھ تعلق بنانا زیادہ تسکین بخش لگتا ہے۔ اس کے برخلاف سماجی دباؤ اکثر ہم جنس پسندوں کو اپنی سیکسوئیلٹی کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا۔ مذہبی ذہن کے مقابل فرائڈ کی بات اس لیے زیادہ وزنی ہے کہ وہ اس کے برعکس ریسرچ کی بنیاد پر بات کرتا ہے، جسے محض مذہبی مزعومات کے ذریعے غلط ثابت کرنا ممکن نہیں۔

۱۹۷۳عیسوی سے پہلے تک ہم جنسیت کو ایک بیماری تصور کیا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ علاج کے ذریعے فرد کو 'نارمل' جنسی رویے کی جانب لایا جا سکتا ہے، مگر جب علاج سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی تو اس رجحان کو بیماریوں کی فہرست سے نکال کر فطری تسلیم کر لیا گیا۔ بہت سے سائنسدان اس رائے کے حامل ہیں کہ ہم جنسی رویہ خلقی اور پیدائشی ہے، نہ کہ سماجی۔

بہت سے افراد ایسے ہیں، جو اگرچہ مخلوط جنسی ہیں مگر ان میں عورت بن کر جینے کی خواہش حاوی ہوتی ہے۔ وہ اپنی غیر واضح مخلوط جنسی شناخت کے ساتھ بے چینی کا شکار رہتے ہیں۔ انھیں یوں لگتا ہے جیسے ان کے مردانہ بدن میں کوئی عورت قید ہو، جس کی آزادی کے بعد ہی وہ نارمل زندگی جی پائیں گے۔ یہ یقیناً ایک اذیت ناک زندگی ہے، جو انہیں قدرت کی غلطی کے نتیجے میں ملتی ہے۔ اگرچہ جدید سائنس نے ان کے لیے تبدیلی جنس کے آپریشن کے ذریعے واضح جنسی شناخت کا انتخاب ممکن بنا دیا ہے، مگر اس عمل کو سماجی قبولیت پانے میں شدید دشواری کا سامنا ہے۔

ایک چوبیس سالہ ایرانی نوجوان علی عسکر جو آپریشن کے بعد نگار کے نام سے لڑکی بن کر اپنی فطری شناخت حاصل کر چکا ہے، اپنے باپ کے رویے سے شدید پریشان ہے۔ نگار کے باپ نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے آپریشن کروایا تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ نگار کے بقول، وہ اسے چائے میں چوہے مار گولیاں ملا کر مارنے کی کوشش بھی کر چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر آپریشن ناگزیر نہ ہوتا تو وہ خدا کے کام میں دخل کیوں دیتی؟ مگر وہ کیا کرے کہ علی عسکر کے نام سے اس کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ وہ مردوں میں کام نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ وہ اسے ہراساں کرتے تھے۔ اور عورتوں کے ساتھ کام کرنے میں یہ رکاوٹ تھی کہ وہ قانونی طور پر عورت نہیں تھی۔

پوری اسلامی دنیا میں ایران واحد ملک ہے، جہاں آیت اللہ خمینی کے فتوے کے ذریعے ایسے آپریشن کی قانونی اجازت دی گئی ہے۔ دنیا میں تھائی لینڈ کے بعد ایران ایسا ملک ہے جہاں تبدیلی جنس کے سب سے زیادہ آپریشن ہوتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مخلوط النسل افراد کے جنسی تبدیلی کے آپریشن کے نصف اخراجات ایرانی حکومت ادا کرتی ہے۔ مگر اس معاملے کا ایک دردناک پہلو بھی ہے کہ ایران میں ہم جنس پسند ہونے کی سزا موت ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر فرد اپنی جنس بدلنے کا خواہاں ہو، لیکن المیہ یہ ہے کہ اپنی سیکسوئیلٹی کے اظہار کی قیمت انہیں سزائے موت کی صورت میں ادا کرنا ہوگی۔ ایسے بہت سے افراد ہیں جنھیں اس سماجی اور حکومتی جبر سے نجات کے لیے وطن سے فرار ہونا پڑا۔

پاکستان میں ایسے افراد کے لیے تبدیلی جنس کا کوئی قانون موجود ہی نہیں، جو اپنے ظاہری مردانہ جسم میں عورت بننے کی خواہش لیے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس اپنی اس عین فطری خواہش کو پورا کرنے کا صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ وہ اپنا مردانہ عضو قطع کروا کے خواجہ سراؤں کی کسی ٹولی میں شامل ہو جائیں۔ ایسے فرد کو نربان کہا جاتا ہے اور خواجہ سرا اسے بہت عزت دیتے ہیں۔ نربان بننے کا عمل بڑے دل گردے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ ایک خطرناک جراحی ہے، جو کسی سرجن کی مدد کے بغیر سرانجام دی جاتی ہے۔ اس میں متعلقہ فرد کی جان بھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ خواہش کتنی منھ زور ہوگی، جس کے لیے کوئی فرد ایک ایسے عضو کی قربانی پر بخوشی راضی ہو جاتا ہے، جس کے لیے کوئی مرد کروڑوں کے عوض بھی حامی نہ بھرے۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر نفرت بھری 'ہونھ' کہہ کر منھ پھیر لیا جائے، یہ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس کے اندر قید عورت کے راستے میں اس کا مردانہ بدن کسی ویلن کی طرح کھڑا ہے، جس کی اسے کوئی خواہش نہیں ہے کہ وہ اس کی حقیقی جنسی شناخت کا دشمن ہے۔ یہ جسم جیل کی کال کوٹھڑی جیسا ہے، جس میں بند ایک عورت کا دم گھٹ رہا ہے۔ سماج اس عورت کو باہر آنے کی اجازت دینے پر راضی نہیں، کیونکہ وہ خود گناہ اور ثواب کے تصور کا قیدی ہے، اگرچہ اس کے پاس اپنے ان تصورات کی کوئی مدلل توضیح بھی نہیں ہے۔ سماج کے پاس ایسے مظلوم انسان پر سوائے استہزا کرنے اور اس کے فطری لطف پر پابندی کا حکم جاری کرنے کے نہ تو کوئی علاج ہے اور نہ ہی کوئی جواب۔ سماج ایسے فرد کی اذیت محسوس کرنے سے یکسر عاری ہے۔ ایک ایسا فرد جو اپنی حقیقی جنسی شناخت کی بازیافت چاہتا ہے، سوسائٹی بے دلیل دھونس کے ساتھ اس پر اپنا جبر نافذ کر دیتی ہے۔

میں ایسی کئی لڑکیوں کے بارے میں اخبارات میں پڑھ چکا ہوں اور چند ایک کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں، جو اپنی محبوبہ کی مستقل رفاقت کی خاطر جنس کی تبدیلی کا آپریشن کروانے کو تیار ہیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ایک لڑکی کے اپنی حقیقی شناخت کو پانے کی تڑپ کا معاملہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس تبدیلی کے بغیر اس کی روح قرار نہیں پا سکے گی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا سماج کے نارمیلیٹی کے دعویداروں کو کسی دوسرے کی جنسیت کو طے کرنے کا حق دیا جا سکتا ہے؟ آخر سماج کے پاس اس تحکم کے لیے کیا دلیل

ہے؟ ممکن ہے کہ وہ یہ کہیں کہ یہ جنسی بے راہروی کا معاملہ ہے، مگر یہ ایک بہت بودی بات ہے۔ جنسی بے راہروی کی اگر تعریف متعین کی جائے تو وہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ کسی بھی فرد کی کسی دوسرے کی جنسی زندگی میں مداخلت ہی اصل میں جنسی بے راہروی ہے، نہ کہ دو آزاد افراد کا باہمی مرضی سے تعلق۔

جہاں تک حقیقی معنوں میں جنسی بے راہروی کا تعلق ہے، اس سے تو ہمارا سماج لتھڑا پڑا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا، جب معصوم بچوں، لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کے ساتھ زیادتی کی خبریں میڈیا پر نہ آتی ہوں۔ ابھی حال ہی میں قصور کے ایک سرحدی گاؤں میں سامنے آنے والا اسکینڈل اس کی بدترین مثال ہے۔ اس سے پہلے جاوید نامی ایک جنونی کا معاملہ بھی سامنے آیا تھا جس نے سو کے قریب بچوں کے ساتھ زیادتی کے بعد انھیں قتل کر کے ان کے اجسام کو تیزاب میں گلا ڈالنے کے بھیانک جرم کا اعتراف کیا تھا۔ یہ تو خیر سیدھے سیدھے غیر قانونی اور غیر اخلاقی معاملات کی بات ہے مگر ہمارے ہاں تو اخلاق مذہب اور قانون کے نام پر بھی جنسی جرائم عام ہیں لیکن انھیں جرم نہیں سمجھا جاتا، بلکہ الٹا شادیانے بجائے جاتے ہیں۔

میرا اشارہ ان شادیوں کی طرف ہے، جن میں دولہا دلہن کی بالکل مرضی شامل نہیں ہوتی۔ کئی معاملات میں تو دونوں ہی کہیں اور شادی کے خواہشمند ہوتے ہیں، مگر انھیں شادی کے مقدس بندھن کے نام پر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ کئی شادیاں تو اتنی انمل بے جوڑ ہوتی ہیں کہ کم عمر بچیوں کو باپ سے بڑی عمر کے شخص سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ عمومی طور یہ وہ عمر ہوتی ہے جب بچیوں کو معلوم تک نہیں ہوتا کہ شادی کس چڑیا کا نام ہے۔ وہ بے چاریاں تو بس نئے کپڑوں کے چاؤ میں ماری جاتی ہیں۔ اگر ہم ریپ کی تعریف کے تعین کی بات کریں تو یہ ایسا عمل ہے جس میں کوئی فرد اپنی مخالف جنس کے فرد کے ساتھ زبردستی جنسی تعلق بنائے۔ اس تعریف کے مطابق دیکھیں تو ہمارے ہاں ہونے والی اکثر شادیاں ریپ کے زمرے میں ہی آتی ہیں۔

ہمارے سماج کی ایک بدنصیب کمیونٹی 'خواجہ سرا' (ہیجڑے)، جن کے لیے ہم نام نہاد نارمل اور مہذب لوگوں کے پاس ایک استہزا اور بھیک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم انھیں ایک ایسی خامی کی سزا دینے پر تُلے ہیں، جن میں ان بے چاروں کا ایک فیصد بھی قصور نہیں۔ سزا بھی یہ کہ ہم انھیں انسان کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ ہم نے ان کی جنسیت کو زبردستی ان کے کردار کے ساتھ نتھی کر دیا ہے، اور کردار بھی ایسا کہ جس پر اٹھتے بیٹھتے 'آخ تھو' کر کے ہم اپنے کردار کا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اس کمیونٹی کے حوالے سے بدچلنی اور بے راہروی کے ہزاروں الزام دہرائیں مگر سچ تو ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ ظالمانہ حد تک غیر انسانی ہے بلکہ یہ رویہ ہمیں اخلاقی حوالے سے بے حد کمزور، گھٹیا اور معذور ثابت کرتا ہے۔

ہمیں کیونکر یہ حق حاصل ہے کہ ہم انھیں محض جنسیت کی بنیاد پر ایک کریہہ بلکہ مضحکہ خیز زندگی جینے پہ مجبور کریں؟ اگر ہم خواجہ سراؤں پر بے راہ روی کا الزام دھرتے ہیں تو یہ کیوں نہیں سوچتے کہ انھیں اس راہ پر دھکیلنے میں ہمارا کتنا ہاتھ ہے؟ وہ کون ہیں جو خوبصورت مخنثوں پر عاشق ہوتے ہیں، ان کے ساتھ تعلق